ISSN 0974-7346

جون ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲—عدد ٦

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰ روپے۔ فی شمارہ ۴۰ روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰ روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰ روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰ روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰ روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051
آئی ایف ایس سی: PUNB0476100
تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ ذی الحجہ ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۵ء | عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

چند مہینوں سے ہندوستان کی سیاست اور اس کے زیر اثر صحافت بظاہر وقت کے سب سے مہتم بالشان مسئلے یعنی وقف کے تعلق سے پریشان اور مضطرب نظر آرہی تھی۔ ارباب حکومت کے ذہن وزبان صرف مسئلۂ وقف کے لئے وقف تھے، مسئلہ کا تعلق مذہبی یا قانونی وفقہی ضرورت سے زیادہ، مسلمانوں کے افلاس اور ان کے استحصال سے جوڑا جارہا تھا کہ اگر وقف کے چند مسائل تشنۂ ترمیم و تنسیخ رہ گئے تو صرف مسلمان ہی نہیں پورا ملک حرمان وخسران کا نوحہ خواں بن جائے گا۔ لیکن بار بار نیش عقرب کی اذیت کو برداشت کرنے والی قوم کے علماء ومشائخ، اس بار ایک ہی بل سے دوبارہ ڈسے جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور علماء ہی کیا، ملت کے دانشوراور سیاسی رہنما بھی ایک خالص ملی و مذہبی مسئلہ کو سیاسی رنگ دینے اور پھر اس سے زیادہ آئینی دستور اور قانونی حقوق کی بے حرمتی کے خلاف کھل کر سامنے آگئے۔ احتجاج کی ایسی شکل، ملک میں دس گیارہ برس میں پہلی بار سامنے آئی۔ ملک کے سب سے بڑے قانون ساز ادارے سے مایوسی نے عدل وانصاف کے سب سے بڑے ادارے سے امید کا رشتہ بہر حال ٹوٹنے نہیں دیا۔ بحثوں اور دلیلوں کا دور شروع ہوا تو لگا کہ زہق الباطل کی سچائی سامنے آیا ہی چاہتی ہے کہ کبھی کرۂ ارض کی بہشت کا درجہ رکھنے والی زمین پر ابلیس کے مشیروں نے مرغزار ختن سے آہوان چمن کو نکالنے کا مشورہ دے دیا۔ ابلیسی نظام کی پہچان یہی بتائی گئی کہ:

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

یہ طبیعتوں کا فساد تھا کہ پہلگام کی خوبصورت فضا معصوموں اور بے گناہوں کے خون سے لہو رنگ ہوگئی، اس ظالمانہ حرکت نے فطری طور پر بے گناہ مقتولوں سے ہمدردی اور قاتلوں سے نفرت کا ماحول بنادیا۔ بجاطور پر پورا ملک اور پوری قوم، غم وغصہ میں ڈوب گئی، سزاو جزااور عتاب وقصاص کے ہنگامے قریب تھا کہ ساری دنیا کے لیے باعث تشویش بن جائیں کہ عام بے گناہوں کی دعا سن لی گئی، نفرت وعداوت کی آگ رقص شرر کا منظر پیش کرنے سے پہلے ہی والصلح خیر کی خنکی سے سرد ہوگئی۔ وقت کا یہ چند روزہ عمل، اپنے ساتھ عبرت اور حیرت کی عجب داستانوں کو پیش کر کے فاعتبروا یا اولی الابصار کا پیغام بھی دے گیا۔ بتا گیا کہ مرد آزاد کی دولت، دلِ روشن اور نفس گرم کے سوا کچھ نہیں اور اس کے برعکس محکوم کا سرمایہ فقط دیدہ نمناک ہی ہے۔ زمین جب

تنگ ہو جائے تو کیا، فضائے گردوں تو بے کرانہ ہے اور رہے گی۔ اور تو اور ابلیس کا یہ دعویٰ بہر حال غلط نہیں نکلا کہ:

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

اب یہ حقیقت دنیا کے سامنے زیادہ واضح شکل میں سامنے آرہی ہے۔ دعا ہے کہ انسانیت اپنے ازلی دشمن کو پہچان سکے۔ دعا یہ بھی ہے کہ جس صلح نے دلوں کو سکون بخشا ہے اسی کی برکت سے عدل و انصاف کو بھی صحیح فیصلوں کی توفیق ملے۔ اب جب کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت میں وقف کے موقوف مقدمہ کے فیصلے کا وقت آن پہنچا ہے، فیصلہ ہو چکا ہے لیکن ابھی محفوظ و مکنون ہے۔ خدا کرے یہ حکومت، جمہوریت، آئین، قانون سب کے لیے انصاف وہدایت کا پیغام لانے والا ثابت ہو۔

***

گذشتہ دنوں جنگ و فساد، نفرت و عداوت، جھوٹ، مکر اور فریب نے جنگ اور آلات جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کو بھی جس طرح پیچھے چھوڑ دیا ہے وہ ہر حساس اور محب وطن شہری کے لیے خلجان و ہیجان کا بڑا سبب بن گیا، حرف حق سے بیزاری کا یہ عالم، رشیوں، منیوں، سنیاسیوں، صوفیوں، درویشوں اور فقیر منش انسانوں کے لیے سوہان روح بنتا جاتا ہے۔ چند دنوں پہلے ایک نہایت علمی اور خاندانی شخصیت کے مالک اور نوجوان دانشور اور اشوکا یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر علی خان محمود آباد کو ایک کلمہ حق کی پاداش میں نذر زنداں کرنے کی کوشش اسی المیہ کا حصہ ہے۔ راجا محمود آباد جیسے نامور ترین ہندوستانی اور مسلم یونیورسٹی کے اولین وائس چانسلر کے پوتے، پروفیسر علی خان محمود آباد نے اپنے علمی مضامین و مقالات اور دانشورانہ اصابت رائے کی وجہ سے اپنے شاندار خاندانی ماضی کے ذکر کے بغیر مقبولیت حاصل کی۔ برسوں پہلے وہ دارالمصنفین آئے تھے اور اپنی شرافت و وضعداری اور خاکساری سے واقعی دلوں پر راج کرنے کا احساس دلا گئے تھے۔ بعد میں انھوں نے ایک اخباری کالم میں دارالمصنفین کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ایسے دانشور کو پولیس کے ریمانڈ میں دیکھ کر پورے ملک کے انصاف پسندوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ شکر ہے کہ عدالت عالیہ نے مشروط طور پر ہی سہی، ضمانت کی راحت دے دی۔

***

سنہ ۲۰۰۱ء میں علی گڑھ کے ایک سفر میں اس وقت کے مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب اور ان کی ابن سینا اکیڈمی کی زیارت کی تھی۔ چوبیس سال پہلے ابن سینا اکیڈمی، کا عالم آغاز تھا، لیکن کتابوں کے منتخب ترین سرمایہ اور عجائبات ونوادر کا ذخیرہ دیکھ کر مولانا مرحوم نے محض ایک فرد کے شوق وذوق اور محنت وجستجو کو دیکھ کر عالم حیرت میں کہا کہ:

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یہ بھی کہا کہ ایسے عظیم الشان کارنامے کی مثال اس زمانے میں نہیں مل سکتی۔ قریب پچیس سال بعد ایک بار ایک اور عامی کا گزر تجارہ ہاؤس کی گلی سے ہوا تو ابن سینا اکیڈمی، کئی منزلوں کی بلندی پانے کے بعد گویا حیدرآباد کے مشہور عالم سالار جنگ میوزیم کا مثنی بن کر ایک نئے حیرت کدہ میں بدلتی نظر آئی۔ اب اس کو دیکھنے کے لئے چند گھنٹوں کی جگہ کئی دنوں کی ضرورت ہے۔ نایاب رسائل کی مکمل فائلوں اور نادر شخصیات اور ریاستوں کی تاریخ پر مشتمل تمام اہم کتابوں کے ذخیرے، محققوں کے لیے بڑی نعمتوں سے کم نہیں۔ کتبے، طغرے، وصلیاں، تختیاں، اور قدیم تہذیب وثقافت کے اصل ساز وسامان درحقیقت انسانی تاریخ کی داستان میں سب کے دامن دل کو کھینچتے ہی نہیں، ہم کلام ہونے کا احساس بھی دلا جاتے ہیں۔ سید احمد شہید کا عمامہ یا سرسید کی باقیات ایک عجب عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔ دیکھنے والا آخر میں وہی کہتا ہے جو مولانا اصلاحی مرحوم کی زبان سے نکلا قول تھا کہ ایسے عظیم الشان کارنامے کی مثال اب کہیں اور ملنا بہت مشکل ہے۔

***

افسوس کہ اسی مہینے میں مظاہر علوم سہارن پور کے مشہور عالم ومحدث مولانا محمد عاقل سہارن پوری نے وفات پائی وہ استاذ الاساتذہ اور علم حدیث میں خاص طور پر اعلیٰ مقام پر فائز تھے، لیکن شہرت اور نام ونمود سے اسی درجہ دور تھے اور چند دنوں بعد یہ خبر ملی کہ مولانا غلام محمد وستانوی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا وستانوی بہت کم وقت اور کم عمری میں اکل کوا کے تعلیمی اداروں اور قرآن مجید سے تعلق پیدا کرنے والے پروگراموں اور پورے ملک کے علمی و تعلیمی اداروں سے مخلصانہ روابط کی وجہ سے مقبول عام وخاص ہوگئے تھے۔ ادھر کئی برسوں سے ان کی علالت کی تشویش ناک خبریں ملتی تھی۔ آخر ایک عمر کی بے قراری کو قرار آہی گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ اللھم ارحمہما واغفرلہما

***

مقالات

محمد مہر علی کا انگریزی ترجمۂ قرآن: ایک جائزہ

زریاب احمد فلاحی

zaryabahmadteacher@gmail.com

محمد مہر علی (۱۹۲۹-۲۰۰۷ء) مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) نژاد معروف مسلم فاضل ہیں۔ عالمی شاہ فیصل اعزاز سے نوازے جانے والے وہ اکلوتے بنگالی صاحب قلم ہیں۔

انہوں نے ملک و بیرون ملک چالیس سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس دوران تصنیف و تالیف کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ نتیجتاً علم و تحقیق کی دنیا کو ان کی درجنوں تصنیفات کی سوغات نصیب ہوئی۔ سیرت النبی اور قرآن مجید کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات بلکہ ہفوات کا انہوں نے *Sirat al-nabi and the Orientalists* (1997) اور *The Qur'an and the Orientalists: An Examination of Their Main Theories and Assumptions* (2004) میں انتہائی عالمانہ اور مسکت جواب دیا۔ عمر کے آخری ایام میں انھیں قرآن مجید کے لفظ بہ لفظ معانی کی انگریزی ترجمانی کی سعادت حاصل ہوئی جو *A Word for Word Meaning of the Qur'an* کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے عنوان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ہر ہر لفظ کے معنی کے لیے ایک ایک انگریزی متبادل کا انتخاب کیا گیا ہے، لیکن درج ذیل متعدد اسباب کی بنا پر ایسا بالعموم ممکن نہیں ہے:

انگریزی مترجمین کو درپیش مشکلات:

۱۔ انگریزی و عربی زبان کے جملوں کی ساخت ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً عربی جملہ فعل سے شروع ہوتا ہے اور انگریزی فاعل سے۔ ایسی صورتحال میں خاص مفہوم کی ادائیگی کے پیشِ نظر کلام میں تقدیم و تاخیر ہونے پر مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔

۲۔ بنیادی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب صحت تعبیر کے لیے مترجمین کو انگریزی ادب کے خزانے میں عربی الفاظ کا ہم معنی لفظ نہیں ملتا۔ عربی زبان میں کثرت سے ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا

انگریزی میں کوئی مترادف نہیں ہے۔

۳۔ عربی میں فعل مضارع زمانہ حال و مستقبل دونوں پر دلالت کرتا ہے جب کہ دیگر زبانوں بشمول انگریزی میں ایسا نہیں ہے۔ اس وجہ سے عربی کے ہزاروں الفاظ کا انگریزی میں ناقص ترجمہ ہوتا ہے۔

۴۔ عربی کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے افعال وضمائر میں مثنی کا صیغہ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان اس صفت سے محروم ہے۔

۵۔ عربی میں (واحد، مثنی اور جمع) اسم الفاعل کے بہت سارے اور متنوع صیغے ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی نظیر تلاش کرنا کارعبث ہے۔

۶۔ عالمی زبانوں میں عربی اپنے حروفِ تاکید کی کثرت وفراوانی کی لحاظ سے ممتاز ہے۔

۷۔ لغت قرآن میں متقارب المعنی اسماء، افعال، حروف اور صفات کی کثرت ہے تاہم ان کے درمیان باریک فرق بھی ہوتا ہے۔ ان کے مترادفات سے انگریزی کا دامن خالی ہے۔[1]

مذکورہ لسانی دشواریوں کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی علمی تجربات سے واضح ہے کہ کسی انسان تک کے کلام کو اس کی اصل زبان کی جملہ خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی غیر زبان میں منتقل کرنا امر محال ہے۔ تاریخ ادبیات عالم شاہد ہے کہ عرب ادباء نے شیکسپیئر کی تمثیلات کو بارہا عربی جامہ پہنانے کی کوششیں کیں، انگریز قلم کاروں نے کتنی بار "الف لیلہ ولیلہ" کی داستانوں کو انگریزی پیراہن عطا کرنا چاہا، عرب، عجم اور مغرب کے اساطین علم وفضل نے عمر خیام کی رباعیات کو کیسے کیسے اپنی اپنی زبانوں کے قالب میں ڈھالنا چاہا مگر ان تخلیقی شہ پاروں کی اصل روح اور دلکشی ورعنائی کو لفظی پیکر نصیب نہ ہو سکا۔ جب انسانی کاوشیں اس درجے کی ہیں تو پھر کلام الٰہی کا کیا کہنا جو اپنے معنی ومفہوم، اسلوب، تراکیب، نظم ونسق، فصاحت وبلاغت اور تاثیر کے لحاظ سے معجزہ ہے۔

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

(i) Daryabadi, Abdul Majid, *Tafsir-ul- Qur'an*, Academy of Islamic Research & Publications, Nadwatul Ulama, Lucknow, 5th ed., 2019, V.1, iii-v .

(ii) عبد اللہ عباس ندوی، ترجمات معانی القرآن الکریم وتطور فہمہ عند الغرب، ص۱۹-۲۳

اس کا اردو ترجمہ "قرآن کریم کے انگریزی ترجموں کا تنقیدی مطالعہ" قمر شعبان ندوی کی قلم سے شائع ہوا ہے۔ اس کے صفحات ۲۶-۳۲ سے رجوع فرمائیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کا کماحقہ لفظی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترجمۂ قرآن دراصل کسی دوسری زبان میں قرآن کی تفسیر مختصر ہے۔ اسے ''تفسیری ترجمہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آیات قرآنیہ کے مدلولات کو اسلوب قرآنی اور جملہ مراد معانی کے پاس ولحاظ کے التزام کے بغیر کسی دوسری زبان میں منتقل کر دینا۔ اسے ''ترجمہ قرآن'' کے بجائے ''ترجمہ معانی قرآن'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمد مہر علی کا ترجمہ اسی قسم کا ہے۔

قرآن مجید کے لفظی ترجمے

اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قرآن کے لفظی ترجمے کی تاریخ ملتی ہے۔ اردو میں اس کے بانی شاہ رفیع الدین ہیں جن کا ترجمہ قرآن کلکتہ سے ۱۸۴۰ء میں طبع ہوا حالانکہ یہ اٹھارہویں صدی کے اختتام سے قبل ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

انگریزی میں ای ایچ پالمر (Palmer) نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا جو ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس نے یہ اسلوب دراصل مفہوم قرآن کو ممکنہ حد تک مسخ کرنے کی غرض سے اختیار کیا۔ آگے چل کر اے جے آربری نے بھی قرآن مجید کا لفظ بہ لفظ اور حرفا حرفا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے پہلے وہ سورہ کی متعدد متواتر آیات کا گروپ بنالیتا ہے اور پھر ایک ترتیب سے ان کے ترجمے پیش کرتا ہے۔

آغاز

محمد مہر علی کے اس ترجمے کی ابتدا منصوبہ بند طریقہ سے نہیں ہوئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ انھوں نے ۵ نومبر ۱۹۹۱ء کو بعد نماز مغرب مسجد نبوی میں بیٹھے بیٹھے سورہ بقرہ کی شروعاتی چند آیات کا انگریزی ترجمہ کر ڈالا۔ بعد ازاں یہ ان کا معمول بن گیا۔ اس طرح پانچ سال کے عرصے میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو اس کا پہلا مسودہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس پہلے مرحلے میں انھوں نے محض ترجمہ پر اکتفا کیا اور جملے کی ساخت اور الفاظ کی ترکیب پر حتی المقدور توجہ مرکوز کی۔ بعد ازاں اس منصوبے میں تبدیلی کی اور اسے وسعت دے کر نظر ثانی کی۔ اب ضرورت کے مطابق الفاظ کے معانی، نحوی مباحث اور تحشیہ کا اضافہ کیا گیا۔ ہر سورہ کے شروع میں تمہیدی گفتگو کی گئی ہے جس میں سورہ کی وجہ تسمیہ، شان نزول، مرکزی عمود اور متعلقہ احادیث پر مختصر اً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دوسرے مرحلے میں یہ ترجمہ ایک

مستقل تصنیف کی شکل اختیار کر گیا۔

طریقۂ کار

قرآن کے متداول انگریزی تراجم میں بالعموم ایک جانب مکمل آیت لکھی ہوتی ہے اور اس کے متوازی انگریزی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس سے قاری آیت کے مفہوم کو بحیثیت مجموعی سمجھ تو لیتا ہے تاہم ایک غیر عرب یہ نہیں جان پاتا کہ کون سا انگریزی لفظ کس عربی لفظ کی نمائندگی کرتا ہے۔ لفظ بہ لفظ ترجمانی اسی مشکل کو دور کرتی ہے۔ اس اسلوب کا مزید فائدہ یہ ہے کہ ایسے میں معنی ومفہوم متن قرآن کی ساخت کا حد درجہ پابند ہوتا ہے اور کسی بھی لفظ کے مفہوم کے حذف وساقط ہونے کا امکان کم رہتا ہے۔ مثلاً اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سورہ الفاتحہ:۵ کا ترجمہ ہے:

(الف)

اِيَّاكَ	You Alone
نَعْبُدُ	we worship
وَ اِيَّاكَ	and You Alone
نَسْتَعِيْنُ	we ask for help[۲]

(ب)

ذُوْ	Possessing
مِرَّةٍ	mental and physical fitness
فَاسْتَوٰى	Then he became upright[۳]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ word for word یعنی قرآنی آیت کے ہر لفظ کا ایک انگریزی متبادل / مترادف فراہم کرنے والا کوئی لفظی ترجمہ نہیں ہے اور فی الواقع ایسا ہو بھی نہیں سکتا جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ انگریزی میں بہت سے عربی الفاظ کے مترادف ہیں ہی نہیں۔ مذکورہ بالا دونوں مثالوں میں مستعمل سات الفاظ میں سے صرف ایک لفظ 'ذُوْ' کے لیے ایک انگریزی لفظ آیا ہے، بقیہ میں ایک عربی لفظ کے لیے دو دو، تین تین اور چار چار انگریزی الفاظ کا سہارا لینا پڑا ہے۔ فاضل مترجم نے بالعموم آیت کے ہر ہر لفظ کا معنی نہیں بیان کیا ہے بلکہ متعلق آیت میں سے دو دو، تین تین، چار چار الفاظ کو علیحدہ کرکے ان کا انگریزی مفہوم ادا کیا ہے۔ اس سے بہتر لفظی ترجمہ شاہ

---

[۲] Muhammad Mohar Ali, *A Word for Word Meaning of The Qur'an*, IPSWICH , Jamiyt Ihyaa Minhaaj al Sunnah , 2003, v.i, p. 2

[۳] Ibid , v.iii, p. 1718

رفیع الدین کا ہے جس میں آیت کے الفاظ کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کا تحت اللفظ ترجمہ دیا گیا ہے۔ ایسے میں قاری کو ہر لفظ کا معنی آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے ۔

فہم قرآن کی راہ مزید ہموار کرنے کے لیے اس ترجمے میں تقریباً جملہ اہم الفاظ کے معانی علیحدہ علیحدہ تحریر کر دیے گئے ہیں۔ مزید براں بالخصوص اسماء و افعال سے متعلق ضروری حواشی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ایک غیر عرب قاری فہم قرآن سے بہرہ ور ہو مثلاً:

(i) Muttaqin (accusative / genitive of muttaqun, sing.muttaqi) = those who are on their guard, those who protect themselves. Active partciple from ittaqa, form VIII of *waqa* (waqy / wiqayah), to guard, to protect. Hence muttaqin means one who protects oneself against Allah's displeasure and punishment by following the guidance provided by Him, hence god-fearing. The meaning is elucidated in the succeeding *ayahs* 3 and 4. (v.1, p.4)

اس میں ”مُتَّقِیْنَ“ کی جامع وضاحت ہے کہ یہ اسم کی مفعولی و اضافی حالت ہے۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ مادہ وقی یقی سے باب افتعال کا اسم الفاعل واقع ہے۔ معنی حفاظت و بچاؤ کرنا ہے۔ یعنی متقی وہ ہے جو ہدایت ربانی کی پیروی کرکے خود کو اللہ کی ناراضگی اور سزا سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہیں سے تقویٰ خوف خدا کا مظہر بن جاتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے کی آیات تین اور چار میں پیش کی گئی ہے ۔

مزید مثالیں پیش ملاحظہ ہوں:

(ii) *Ittakhadhtum* = you (all) took, took up, adopted (v ii.m.pl.past from *ittakhadha*, form of viii ‘akhadha’, to take, to receive).(v.I , p.24)

(iii) Pharaoh = title of ancient Egyptian kings.The particular Pharaoh during whose time Musa was born and in whose house he grew up is stated to be Ramses II of the 19th dynasty; and the Pharaoh who came in pursuit of Musa and was consequently drowned was Ramses's son Minfitah...(v. I, p.23)

(iv) Quraysh = The Quraysh tribe who inhabited Makkah and to whom the Prophet , peace and blessings of Allah be on him , belonged.(v.iii, p.2023)

(v) Iram = The name of the ancestor of the A'd people which was given to the locality where they lived in southern Arabia.

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہاں فہم قرآن کے لیے مطلوبہ مواد وافر مقدار میں دستیاب

ہے۔ مصنف نے اس ترجمہ و تحشیہ میں عربی کی قدیم اور مستند تفاسیر سے جابجا استفادہ کیا ہے۔ ان میں تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، البحر المحیط، الکشاف، فتح القدیر، التفسیر الکبیر، تفسیر الماوردی وغیرہ کے حوالے کثرت سے وارد ہیں۔

قرآن مجید کے بہت سے الفاظ مخصوص معانی کے متحمل ہیں۔ ان کی توضیح و تشریح کے لیے مستند لغات، قاموس اور معانی الفاظ پر خصوصی توجہ دینے والی تفاسیر سے استفادہ کے علاوہ درجہ ذیل تصانیف سے بھی رجوع کیا گیا ہے جو قرآنی لفظیات کی خاص کتابیں شمار کی جاتی ہیں:

۱. قاموس القرآن أو إصلاح الوجوہ والنظائر فی القرآن الکریم، للحسین بن محمد الدامغانی
۲. بصائر ذوي التمییز في لطائف الکتاب العزیز للفیروزابادي
۳. المفردات في غریب القرآن الکریم للاصفهاني
۴. مجاز القرآن لأبي عبیدة معمر بن المثنی
۵. غریب القرآن وتفسیرہ لمبارک الزیدی
۶. معاني القرآن واعرابه للزجاج
۷. نزهة الاعین النواظر في علم الوجوہ والنظائر لابن الجوزي
۸. معجم غریب القرآن: مستخرجا من صحیح البخاري لمحمد فؤاد عبد الباقی
۹. معجم الفاظ القرآن الکریم، مجمع اللغة العربیة، قاهرہ

ان سب اہتمام کے باوجود بہت سے مقامات پر درست ترجمانی کا سنگ میل عبور نہیں ہو سکا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں چھ مقامات پر "بَلَآءٌ" کا لفظ آیا ہے۔ اس میں آزمائش / امتحان کے ساتھ ساتھ انعام و اکرام، نوازش، مدد، مہربانی، فضل، احسان کا بھی مفہوم شامل ہے۔ خود محمد مہر علی بھی اس سے واقف ہیں۔ سورہ بقرہ:۴۹ کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں:

Bala= trial, test, tribulation -This word is used in respect of both good and bad things. Hence the commentators interpret the clause in two different ways, namely, that either (a) the persecution by Pharaoh was a great test or (b) the saving of you by Allah from the Pharaoh's persecution was a great favour -(see Al-Tabari , I , 274-275 , Ibn Kathir, I, 128-129)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بِاٰلَآءِ کے مواقع استعمال پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مقام پر یہ نجات مل جانے اور سرخروئی حاصل ہو جانے کے بعد آیا ہے۔ لہٰذا سیاق مقتضی ہے کہ اس کے لیے انعام اور نوازش کی تعبیرات کو ترجیح دیا جائے، لیکن ہر جگہ چوک ہوئی ہے۔[۴]

تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ(سورہ النساء:۹۲) میں وارد "من" کے مفہوم کی ادائی میں بھی دشواری آگئی ہے۔ اس کا ترجمہ seeking Allah's forgiveness کیا ہے، گویا کہ توبہ کو توبہ الی یعنی معافی مانگنے کے معنی میں لیا ہے حالانکہ یہاں توبہ تاب علی یعنی مہربانی کرنے کے مفہوم میں وارد ہے۔ ترجمہ ہوگا: "یہ اللہ کی طرف سے مہربانی ہے۔" مکمل عبارت اس طرح ہوگی: تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ علی عبادہ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے قتل خطا کے سلسلے میں جو کچھ رہنمائی فرمائی ہے وہ اللہ کی طرف سے بندوں پر مہربانی ہے۔

سورہ النساء ہی کی آیات ۴۸ اور ۱۱۶ "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ..." میں وارد "دُوۡنَ" کا ترجمہ 'اس کے سوا' اور 'اس سے کمتر' بھی ہو سکتا ہے۔ شاہ عبد القادر کا ترجمہ ہے:

"اور بخشتا ہے اس سے نیچے جس کو چاہے۔"

محمد مہر علی اور عام طور سے مترجمین نے 'besides' یعنی 'سوا' کا ترجمہ کیا ہے جب کہ دوسری نصوص کی روشنی میں کم تر کا ترجمہ درست ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض گناہ شرک سے بھی بڑے ہوتے ہیں، جیسے خدا کے حضور کبر شرک سے بھی بڑا گناہ ہے۔ ابلیس کا گناہ شرک نہیں ہے، اس کے لیے قرآن مجید میں استکبار کا لفظ آیا ہے۔[۵]

اَعُوۡذُ کا درست ترجمہ ہے: "میں پناہ میں آتا ہوں، میں پناہ لیتا ہوں" پناہ مانگنے کے لیے استعاذہ آتا ہے۔ محمد مہر علی نے ان دونوں کے درمیان کسی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے اور ان کا یکساں ترجمہ

---

[۴] تفصیلی مواد کے لیے رجوع فرمائیں: محی الدین غازی، رہنمائے ترجمہ قرآن، ہدایت پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء، ص ۳۹۰-۳۹۴

[۵] ماخذ سابق، ص ۳۱-۳۲

seek refuge کیا ہے۔

عربی زبان میں لام کے متعدد استعمالات ہیں، مثلاً لام برائے تبیین، لام برائے تاکید، لام برائے تعلیل وغیرہ۔ محمد مہر علی بھی دیگر مترجمین کی طرح ان کے درمیان اشتباہ کا شکار ہوئے ہیں۔ مثلاً:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ (سورہ طٰہٰ : ۲۵-۲۶) میں لام برائے تبیین کا استعمال ہوا ہے۔ درست ترجمہ ہے:

"کہا میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے، اور میرا کام آسان کر دے۔" (فتح محمد جالندھری)۔ محمد مہر علی نے دونوں جگہ لام برائے تعلیل کا ترجمہ کیا ہے:

"He said: "My Lord , expand for me my heart." And make easy for me my affair."

سورہ الاحزاب: ۷۱ کے ترجمے میں پہلے لام کو لام برائے تعلیل کا مان کر ترجمہ کیا ہے اور دوسرے کو لام برائے تبیین کا مانا ہے: "يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ...

"He will set right for you your deeds and forgive your sins."

اسی طرح لام برائے ظرف یا توقیت اور لام برائے تعلیل کے درمیان اشتباہ کی مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً: "اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (سورہ الْمُطَفِّفِيْنَ : ٤-٥) میں لام برائے توقیت واقع ہے۔ درست ترجمہ ہوگا: "کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟" (سید مودودی)

محمد مہر علی لام برائے تعلیل کا ترجمہ کرتے ہیں:

"Do there not believe such people that they shall be resurrected for a day very grave."

سورۃ الاعراف: ۱۸۷ کے ٹکڑے "لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ" کا ترجمہ سبھی نے لام توقیت کا کیا ہے۔ محمد مہر علی کا ترجمہ ہے:

"None can disclose its time except He."

لام کی طرح باء کے بھی متعدد استعمالات ہیں۔ مثلاً یہ کبھی برائے ملابست / مصاحبت ہوتا ہے، کبھی برائے استعانت تو کبھی برائے سببیت۔ سورہ الشمس: ۱۱ "كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ" میں باء

برائے ملابست یا مصاحبت ہے۔ ترجمہ ہوگا: ”ثمود نے جھٹلانے کے ساتھ ساتھ سرکشی کی۔“
محمد مہر علی نے باء برائے سببیت کا ترجمہ کیا ہے:

" There did disbelieve the Thamud by their transgression."

حالانکہ انھوں نے سورہ النساء:۱۶۶، سورہ الاسراء:۵۲، اور سورہ الفرقان:۵۸ میں باء برائے ملابست یا مصاحبت کا درست ترجمہ کیا ہے، وہیں سورہ الاسراء:۴۴ میں وارد اس کا لحاظ نہیں ہو سکا ہے اور مفعول کا ترجمہ لکھا ہے۔

سورہ البقرہ:۲۳۱ میں واقع ”فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ“ کا درست ترجمہ ”mature /reach/ fulfil“ وغیرہ نہیں ہے جیسا کہ محمد مہر علی اور انگریزی کے دیگر معروف ومشہور درجنوں مترجمین نے لکھا ہے بلکہ ”about to fulfil / reach / mature“ ہے۔ بلغ کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی کسی مدت کا ختم ہو جانا ہے اور دوسرا کسی مدت کا خاتمے کے قریب ہونا ہے۔ یہاں یہی دوسرا معنی مراد ہے کیوں کہ اس میں طلاق رجعی کی بات ہو رہی ہے جس میں شوہر کو رجوع کا اختیار عدت کے خاتمے سے پہلے ہوتا ہے۔ اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے: ”وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں۔۔۔“

آیت ۲۳۲ اور ۲۳۴ میں بھی وارد ”فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ“ سے یہ مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ آیت ۲۳۲ میں مطلقہ عورت عدت مکمل کر چکی ہے: ”وہ عورتیں اپنی میعاد (عدت) بھی پوری کر چکیں ۔۔۔“ (اشرف علی تھانوی) وہیں آیت ۲۳۴ میں بیواؤں کی عدت پوری کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا ان میں mature/fulfil/complete/reach وغیرہ ترجمہ کرنا درست ہے۔

سورہ الطلاق:۲ ” فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ ...“ میں بھی عدت کے خاتمے کے قریب ہونے کا بیان ہے۔ لہٰذا محتاط ترجمہ کیا گیا ہے: ”پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں ۔۔“ (اشرف علی تھانوی)، جب کہ عام طور سے انگریزی مترجمین بشمول محمد مہر علی درست ترجمہ نہیں کر پائے ہیں۔

محمد مہر علی نے سورہ بقرہ:۱۱۵، سورہ الشعراء:۶۴ اور سورہ الانسان:۲۰ میں وارد ثَمَّ (فتحہ کے ساتھ) کا درست ترجمہ there, thither اور thereat کیا ہے مگر سورہ التکویر:۲۱ ”مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ“ میں اس کی رعایت نہیں ہو سکی ہے۔

کسی جملے میں جب 'لَمَّا' ظرفیہ آتا ہے تو اس میں کسی عمل کے بار بار ہونے کا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ ماضی میں ایک بار ہونے کا مفہوم ہوتا ہے۔ فعل کے بار بار ہونے کا مفہوم 'اِذَا' سے ادا کیا جاتا ہے۔اس کے لیے انگریزی میں whenever کا لفظ آتا ہے۔ محمد مہر علی نے الأعراف: ۱۳۱ میں 'اِذَا' کا ترجمہ 'if' اور آیت: ۱۳۵ اور الزخرف: ۵۰ میں 'اِذَا' فجائیہ کا ترجمہ 'Lo' کیا ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۞ (یونس :۸۳)۔

اس آیت میں اٰمَنَ لِمُوْسٰى اور عَلٰى خَوْفٍ کی درست ترجمانی میں محمد مہر علی سے چوک ہوئی ہے۔آمن لہ کا مطلب کسی کے دعوے، خبر / بات کو سچ مان لینا ہے۔ اس کے لیے حوالگی، تفویض، تسلیم، انقیاد اور اطاعت شرط نہیں ہے۔ لیکن آمن بہ کے لیے یہ ساری چیزیں شرط ہیں۔اٰمَنَ لِمُوْسٰى کا درست ترجمہ believed Musa کے بجائے trusted Musa ہوگا۔ اسی طرح عَلٰى خَوْفٍ کا استعمال یہاں due to fear of کے بدلے in spite of the fear of کے مفہوم میں ہے۔ یہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ۔۔۔(البقرۃ: ۱۷۷) کے اسلوب میں واقع ہے اور 'ذُرِّيَّةٌ' کا حال ہے۔

مذکورہ بالا کمزور پہلوؤں کے باوجود یہ انگریزی ترجمہ افادیت سے بھرپور ہے اور اپنے نصب العین میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔اس لیے کہ فاضل مترجم نے قدیم اور مستند مآخذ و مصادر سے خوب استفادہ کیا ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں اس کے تعارف، وجہ تسمیہ، شان نزول، مرکزی عمود وغیرہ سے بحث کی ہے۔ بعد ازاں دوران ترجمہ الفاظ کی جامع تحقیق ہے۔ اس سلسلے میں دیگر متعلقہ قرآنی آیات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اس ترجمہ میں ان کے محل وقوع / صفحات کے تذکرے کا اہتمام ہے۔اس کے پہلو بہ پہلو مطلوبہ مقامات پر نحوی مباحث پر ضروری رہنمائی بھی کی گئی ہے۔

مذکورہ لسانیاتی امور پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے اس تصنیف میں تحشیہ کا پہلو نمایاں نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں حواشی کم سے کم ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ کوئی ضمیمہ بھی شامل نہیں ہے۔ زیادہ تر مقامات پر الفاظ کی تحقیق کے بعد ہی فحوائے کلام زیر بحث آگئے ہیں۔ اس سلسلے میں تفسیر قرآن کے بہترین اصول 'القرآن یفسر بعضہ بعضا' کی پیروی کی گئی ہے اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں واقع 'نَسْتَعِيْنُ' کی لفظی تحقیق کے بعد

آیت کے مفہوم کی توضیح ہے کہ اس میں توحید مطلق کی منادی ہے۔ قرآن کے مطابق اس کے تین نمایاں پہلو توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء وصفات ہیں۔ محمد مہر علی نے ص ۱۲ پر بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ایک طرح سے پورا قرآن ہی کسی نہ کسی شکل میں توحید سے بحث کرتا ہے۔ کسی مخلوق کو ان میں سے کسی بھی طرح اللہ کا شریک ٹھہرانا شرک کی قبیح ترین صورت ہے (ج ۱، ص ۲)۔ اسی صفحہ پر الْمُسْتَقِيْمَ کا معنی بیان کرنے کے بعد یہ تشریح ہے: ''سیدھا راستہ'' کا مطلب قرآن اور نبی کا تجویز کردہ راستہ ہے۔ یہ توحید اور اسلام کا راستہ ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقام جیسے کہ آل عمران: ۵۱، مریم: ۳۶، زخرف: ۶۴ وغیرہ پر انبیاء کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ 'اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ' (ترجمہ: بیشک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے)۔

مزید براں آل عمران: ۱۰۱ میں ارشاد ربانی ہے کہ ''جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہی ہے جس کو صراط مستقیم کی ہدایت ملی۔'' آگے البحر المحیط کے حوالے سے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان اور مومن جب سیدھی راہ کی ہدایت کی دعا کرتا ہے تو وہ توحید کے راستہ پر دوام و ثبات قدمی کا طالب ہوتا ہے۔ اس آیت میں ہر ہر موقع سے صحیح فیصلہ اور صحیح قدم کی رہنمائی کے لیے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرنے کی تعلیم ہے۔

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تشریح میں النساء: ۶۹ کا برمحل حوالہ ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

(ترجمہ: اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (اپنا خاص) انعام کیا ہے (یعنی) پیغمبر اور اولیاء اور شہداء اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں)۔

فاضل مصنف نے یہاں یہ نکتہ سنجی بھی خوب فرمائی ہے کہ یہ آیت اسلام کے ایک اور خاص پہلو کی تاکید کر رہی ہے یعنی قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اسی پیغام کا تسلسل وتکملہ ہیں جو سابقہ جملہ انبیاء ورسل لے کر آتے رہے ہیں۔ اس کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کا دین تمام مخلوقات کے لیے ایک ہی رہا ہے۔ جملہ انبیاء ورسل نے اسی کی

دعوت دی۔ لہٰذا اسلام اسی آفاقی دین الٰہی کی تجدید و احیاء اور تسلسل و تکمیل ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں جملہ انبیاء ورسل اور صحف سماویہ پر ایمان لانے کی بات کی گئی ہے۔

اس سیاق میں تقابلی مطالعے کی اہمیت مسلم ہے جس کی کچھ جھلکیاں محمد مہر علی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ سورہ یوسف کے آغاز میں یہ پہلو خاصا ابھرا ہوا ہے۔ مثلاً ج ۲، ص ۷۲۷ پر سورہ یوسف: ۱۸ کے حاشیے میں قرآن اور توریت کے بیانات کا موازنہ درجہ ذیل ہے۔ عہد نامۂ قدیم کے مطابق حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کی جھوٹی داستان پر بلا تامل یقین کر لیا اور یوسف کی واپسی سے مایوس ہو کر سالہا سال اس کا ماتم کرتے رہے۔ تاہم قرآن کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب اپنی فراست سے معاملے کی نوعیت کو بخوبی بھانپ لیتے ہیں کہ یہ ایک بناوٹی و من گھڑت قصہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اعلیٰ ظرفی کا پیکر بن کر صبر جمیل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اللہ سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

تقابلی مطالعے کی ایک اور مثال سورہ فاتحہ کے تعارف میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''کسی اور مذہبی صحیفے میں سورہ فاتحہ جیسی اعلیٰ وارفع اور ایجاز و اختصار کی حامل کوئی دوسری دعا نایاب ہے''۔

محمد مہر علی ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ انہیں قرآن کی حقانیت پر پختہ یقین ہے۔ ان کے مطابق اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور وہ انسانوں کے لیے صحیح ہدایت ربانی ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی درجن بھر سے زیادہ قرآنی آیات کا حوالہ پیش کیا گیا ہے، تاہم اس ترجمہ وتحشیہ کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ متعدد معاصر موضوعات مثلاً صنفی مساوات، تعددی ماحول میں اقلیتوں کے مسائل، صنفی بحران، جہاد، اسلام مخالف لہر، آزادئ نسواں، بقاء باہم وغیرہ پر قارئین کی رہنمائی نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے حواشی میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جن لغزشوں کا اس ترجمہ میں ارتکاب ہوا ہے وہ انگریزی اور اردو تراجم قرآن میں عام ہیں، لہٰذا اس ضمن میں مصنف تنہا نہیں ہیں تاہم بہتر ہوتا کہ وہ روایت شکن ثابت ہوتے اور دور جدید کے حل طلب امور پر بھی قاری کو ضروری مواد فراہم کرتے تاکہ اس ترجمہ وتحشیہ کی افادیت و انفرادیت کا دائرہ وسیع تر ہوتا۔

حیدرآباد دکن اور اہل جنوب کی علمی افادہ واستفادہ کے لئے خدمات

ڈاکٹر راہی فدائی

موبائل نمبر:۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶

اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بالغہ ہے کہ اس نے دو ایسے عمدہ امور کی تخلیق فرمائی جو ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہونے کے علاوہ ازلی وابدی بھی ہیں۔ کائنات ہی نہیں بلکہ ماسوا اللہ کا ہر ذرّہ ان دونوں محرکات کے مابین اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ مخلوقات کا یہ سفر معلوم و متعارف منزلوں کی طرف بھی ممکن ہے اور نامعلوم و غیر متعارف منازل کی جانب بھی رواں دواں ہو سکتا ہے۔ بظاہر معمولی نظر آنے والے یہ دونوں مراکز حقیقتاً غیر معمولی اور انتہائی گرانقدر خزائن و معادن ہیں۔ ان میں سے ایک "افادہ" کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور دوسرا "استفادہ" کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ افادہ واستفادہ ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں۔ افادہ کا عمل استفادہ کے بغیر بے سود ہے اور استفادہ کا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب تک کہ وہ افادے کی کارفرمائی نہ ہو۔

خدائے خالق ومالک نے اپنی مخلوق کو لفظ کُن کے ذریعہ اور اپنے بندوں کو "علّم الانسان مالم یعلم" (العلق:۵)، "وعلّم آدم الأسماء کلھا" (البقرة:۳۱)، "الرحمن علّم القرآن خلق الإنسان علّمہٗ البیان" (الرحمٰن:۲)، "قالوا سبحانک لا علم لنا إلاّ ما علّمتنا" (البقرة:۳۲) کے ارشادات عالیہ کے توسط سے "افادہ" فرمایا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ خلق اللہ نے "قالتا أتینا طائعین" (فصلت:۱۱) کہہ کر خوب استفادہ کیا۔ یہ مفید سلسلہ روزازل سے جاری ہے اور صبح قیامت تک باقی رہے گا۔ اس نورانی زنجیر کے مقدس حلقے یعنی رب تعالیٰ کے محبوب بندے حضرات انبیاء و رُسل نے بھی بحکم خداوندی افادہ کے فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی بلکہ اپنے اپنے عہد کے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا پورا موقع عطا فرمایا۔ افادہ واستفادہ کا یہ ازلی تسلسل خدائے عزوجل کے محبوب ترین بندے خاتم النبیین رحمۃ للعالمین سرور کائنات فخر موجودات احمدِ مجتبیٰ

محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین کے خیر القرون میں پہنچا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس افادہ و استفادہ کے دائرے کو لامحدود نورانی وسعتوں سے مالامال فرماتے ہوئے ساری انسانیت کے آگے تعلیم (افادہ) اور تعلّم (استفادہ) کی اہمیت کو واشگاف انداز میں بیان فرمایا، بالخصوص اپنی عزیز ترین امت کو "طلب العلم فریضۃ۔ اطلبوا العلم ولوکان بالصین" وغیرہ ارشادات عالیہ کے ذریعہ افادہ و استفادہ کے مختلف و متنوع صورتوں سے آگاہ فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخ کے صفحات پر تعلیم و تعلّم کے لئے دامے درمے سخنے تعاون کرنے والے اصحاب ثروت و اہل دُوَل کے کارناموں کو روشن و تابناک دیکھتے ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کی چوتھی دہائی (۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء) میں قائم شدہ دَکن کی آصف جاہی سلطنت کے بانی نظام الملک میر قمر الدین علی خان فتح جنگ آصف جاہ اول (متوفی ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) جنہیں شاہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب (عہد حکومت ۱۰۶۹ھ / ۱۱۱۸ھ) نے سنہ ۱۱۰۲ھ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب عطا کیا تھا، ایک انتہائی دلیر و ذہین سپہ سالار ہونے کے علاوہ بڑے ہی فیاض اور صاحب دل واقع ہوئے تھے۔ آپ عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آپ کو مشہور و معروف عظیم صوفی شاعر مرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۱۳۳ھ) سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آصف جاہ میر قمر الدین کا نسبی تعلق نامور صوفی بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (متوفی ۶۳۲ھ) کی اولاد سے تھا۔ میر قمر الدین فتح جنگ کے والد ماجد میر شہاب الدین غازی الدین فیروز جنگ (متوفی ۱۱۲۲ھ مطابق ۱۷۱۰ء) عہد شاہ عالم بہادر شاہ محمد معظّم (متوفی ۱۱۲۴ھ) میں گجرات کی صوبہ داری پر فائز تھے۔ میر قمر الدین کے جدّ امجد صدر الکل میر عابد خاں بہادر (متوفی ۱۰۳۲ھ) عہد شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں (متوفی ۱۰۷۶ھ) میں سمرقند (ایران) سے ہندوستان تشریف لائے۔ شاہ جہاں نے آپ کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے صاحبزادے اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) کے خصوصی مصاحبوں میں انہیں شامل کر دیا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۸۶ء میں جب گولکنڈہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت کی جنگ میں خواجہ

عابد خاں جاں بحق ہوئے۔[۱]

میر قمر الدین آصف جاہ اول کے فرزند چہارم نظام الملک میر نظام علی بہادر آصف جاہ دوم (متوفی ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) بہ مصداق "پسر نمونۂ پدر است" عالی ہمت و صاحب جود وسخا تھے۔ آپ کے بعد آپ کے دوسرے صاحبزادے نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ سوم (متوفی ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء) بھی داد و دہش اور انفاق فی سبیل اللہ میں اپنے آباء واجداد کے عکس جمیل تھے۔ آصف جاہ چہارم میر فرخندہ علی خاں نظام الملک ناصر الدولہ ابن نواب سکندر جاہ (متوفی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء) اور آصف جاہ پنجم میر تہنیت علی خان نواب افضل الدولہ ابن نواب ناصر الدولہ (۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء) اپنے اجداد کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہوئے انگریز نگرانوں کے تسلط کے باوجود افادۂ عام اور خیر خواہیٔ عوام میں سرگرم رہے۔ بالخصوص آصف جاہ ششم نظام الملک میر محبوب علی خاں (متوفی ۱۳۲۹ھ /۱۹۱۱ء) ابن نواب افضل الدولہ اور عظیم ریاست حیدرآباد کے آخری حکمران نظام میر عثمان علی خاں بہادر (ولادت ۱۸۸۶ء / وفات ۱۹۶۷ء) جنہوں نے سنہ ۱۹۱۱ء سے حیدرآباد کی وسیع وعریض ریاست پر ہندوستانی حکومت میں ضم کئے جانے تک بے حد کامیابی وکامرانی کے ساتھ حکومت کی۔ انھوں نے اپنے پیش رو حکمرانوں کے مقابلے میں افادہ واستفادہ، تعلیم وتعلم اور علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں غیر معمولی خدمت انجام دی۔ آخر الذکر دونوں نوابوں نے مختلف علوم وفنون کے فروغ میں قابل قدر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ملک بھر کے دینی مدارس، عصری تعلیم گاہوں اور زبان وبیان کے اداروں نیز شعر وسخن کی انجمنوں کے لئے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیے، حتیٰ کہ غیر ملکی تعلیمی مراکز بھی ان حاتم دوراں شخصیتوں کی سخاوت سے محروم نہیں رہے۔ آصف ششم میر محبوب علی خاں کے عہد حکومت ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۱ء اور آصف ہفتم میر عثمان علی خاں کے عہد حکمرانی کے دوران ساٹھ (۶۰) سال سے زائد عرصے تک علوم وفنون کے ان محافظوں نے قوم وملت ہی کی نہیں بلکہ ساری انسانیت کی خیر خواہی میں خود کو وقف کر دیا تھا۔

---

[۱] راہی فدائی ڈاکٹر، تذکرہ محدثین جنوب اور دیگر مضامین (بسلسلۂ جنوب کے اصحاب کمال جلد سوم)، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد، ۲۰۲۰ء۔ ص:۲۰۸۔۲۰۹

مذکورہ دونوں صاحبان حشم و خدم کے عطایا و سخایا سے فیض یاب ہونے والے ممتاز و معروف تعلیمی اداروں میں دارالعلوم دیوبند، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بنارس ہندو یونیورسٹی، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف، حیدرآباد تلگو اکیڈمی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور، سرسی۔ وی، رامن سائنس اکیڈمی، بنگلور، بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایشیا کا عظیم دینی تعلیمی ادارہ دارالعلوم دیوبند، جس کی داغ بیل سنہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں حاجی سید محمد عابد حسین دیوبندی (متوفی ۱۹۱۲ء) اور فضل الرحمٰن عثمانی نے ڈالی اور سنہ ۱۲۸۶ھ میں علامہ محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ) نے اس پودے کو شجر طوبیٰ بنادیا اور مدرسہ کو بام عروج پر پہنچا کر مایۂ ناز یونیورسٹی (دارالعلوم) بنادیا۔ اس کے ذمہ داروں نے ۱۸۸۷ء میں مدرسے کے تعاون کے سلسلہ میں ایک درخواست نواب میر محبوب علی خاں آصف ششم (متوفی ۱۹۱۱ء) کی خدمت میں پیش کی، جس پر ایک سو کلدار روپئے ماہانہ جاری کئے گئے۔[۲] پھر پانچ سال بعد ۱۹۰۲۔۱۹۰۳ء میں اس امداد میں پچیس کلدار روپے کا اضافہ کیا گیا۔ یہ تعاون چھ سال تک اسی طرح (۱۲۵ روپے کلدار) جاری رہا۔ بعد ازاں ۱۹۰۸۔۱۹۰۹ء میں آصف سادس (ششم) نے اس میں مزید اضافہ فرماتے ہوئے دوسو پچاس (۲۵۰) روپے کلدار ماہانہ کردیا۔ جب آصف سابع (ہفتم) نواب میر عثمان علی خاں کا دور آیا تو دارالعلوم کی جانب سے اخراجات مدرسہ بڑھ جانے کی وجہ سے زر تعاون بڑھانے کی درخواست کی گئی۔ اس درخواست کو شرف قبولیت عطا کرتے ہوئے میر عثمان علی خاں نے اپنے فرمان مؤرخہ ۲۳؍ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۱۳ء کے ذریعے مدرسہ کی امداد ماہانہ پانچ سو (۵۰۰) کلدار روپے ماہانہ جاری فرمادیا۔ اس کے ساتھ ہی آصف سابع نے قاسم نانوتوی کے صاحبزادے مدرسہ کے مہتمم مولانا محمد احمد (متوفی ۱۹۲۸ء) کی خواہش پر مدرسہ کے نظام میں بہتری لانے کی غرض سے مولانا کی ذات کے لئے ماہانہ ایک سو روپے کلدار منظور فرمایا۔ امداد

---

(۲) کلدار روپیہ سے مراد شہر حیدرآباد میں واقع دارالضرب (ٹکسال جہاں سکے ڈھالے جاتے ہیں) میں ڈھالا گیا چاندی کا روپیہ ہے جس کی مالیت آج (دسمبر ۲۰۲۴ء) ۹۱۶ روپئے ہے اور بطور نادر سکے کے ڈھائی ہزار روپئے کے قریب ہے۔

وتعاون کا یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک بلاتوقف جاری رہا۔ اس عرصے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس کے مد نظر مہتمم دارالعلوم نے پھر ایک درخواست مؤرخہ ۳۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ / ۳۱/ جولائی ۱۹۱۶ء آصف سابع کی خدمت میں ارسال کی۔ اس درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے مؤرخہ ۶/ ذی قعدہ ۱۳۳۴ء / ۵/ ستمبر ۱۹۱۶ء مہتمم صاحب کی امدادی رقم میں مزید پانچ سو (۵۰۰) کا اضافہ فرمایا اور ساتھ ہی مدرسہ کی مد میں بھی تین سو (۳۰۰) کلدار روپے کا اضافہ کر دیا۔ درخواست کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا اور ہر بار کچھ نہ کچھ اضافہ کیا جاتا رہا، بقول ڈاکٹر سید داؤد اشرف:

دارالعلوم دیوبند کی امداد میں اضافہ کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ عرض داشت مؤرخہ ۲۸/ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ (مطابق) ۲۰/ مارچ ۱۹۲۰ پیش ہونے پر جس میں امداد میں اضافے کے لئے باب حکومت (کابینہ) کی سفارش درج تھی، امداد ایک ہزار کلدار ماہانہ کر دی گئی (سالانہ بارہ ہزار روپے)، اس کے علاوہ مہتمم (مولانا محمد احمد ابن مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کا وظیفہ بھی پانچ سو کلدار ماہانہ کر دیا گیا۔[۳]

آصف سابع نواب عثمان علی خاں کے دور میں جس طرح امدادی رقوم کا فیاضانہ اجرا ہوتا تھا، اسی طرح ان رقوم کا تحفظ اور ان عطیات کے صحیح استعمال کی نگرانی بھی پوری مستعدی کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اگر کہیں معاملات درست نہ ہوں تو مناسب کارروائی بھی کی جاتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف رقمطراز ہیں:

دارالعلوم دیوبند کے انتظامی حالات کے بگڑنے کی اطلاع ملنے پر انہوں نے (آصف سابع) فرمان مؤرخہ ۱۵/ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ / ۶/ مئی ۱۹۲۸ء جاری کیا کہ ہندوستان کی قدیم مذہبی درسگاہ دیوبند کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ منتظمین کے باہمی جھگڑوں اور چند دیگر وجوہ سے اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ اب جبکہ ایک قدیم درسگاہ خانگی کشمکش کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے تو ہماری امداد کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اور آئندہ امداد کی حفاظت کی غرض سے اس کی معقول نگرانی ہمارے کسی عہدہ دار کے ذریعے ہونا ضروری ہے۔ اس لئے مناسب

---

[۳] سید داؤد اشرف، ڈاکٹر، حیدرآباد کی علمی فیض رسانی، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء۔ ص:۹۔۱۰

ہوگا کہ اس مدرسہ کو ہمارے محکمہ تعلیمات کے تحت کر کے اس کی سختی سے نگرانی کرائی جائے۔[۴]

نواب موصوف کے مذکورہ بالا بیان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نواب میر عثمان علی خاں جو دارالعلوم دیوبند کے معطی، محسن و مربی اور ہمدرد و بہی خواہ رہے۔ ان کی اس سخت تنبیہ سے دارالعلوم کے حالات سنبھل گئے، اس کی کیفیات میں نمایاں تبدیلی آئی ہوگی اور اس کا نتیجہ خوش گوار ہونے کی وجہ سے ہی امداد تادیر جاری رہی۔

سرزمین ہند کا ایک پُرشکوہ تعلیمی ادارہ جو اپنے عمدہ و درخشندہ نظام تعلیم، اعلیٰ معیاری تدریس اور اپنے سنجیدہ مزاج و وسیع منہاج کی وجہ سے سارے عالم میں انتہائی احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، وہ علمی دنیا میں "دارالعلوم ندوۃ العلماء" (لکھنؤ) کے نام سے مشہور و متعارف ہے۔ یہ ادارہ دراصل دینی تعلیم کے مایہ ناز مرکز دارالعلوم دیوبند اور عصری علوم و فنون کے منبع و معدن "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" کے درمیان بظاہر واقع خلیج کو پاٹنے اور دونوں کی خوبیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے اہل علم و فضل اکابر کے تعاون و مشورہ سے سنہ ۱۳۱۲/ مطابق ۱۸۹۴ء بمقام مدرسہ فیض عام کانپور "تحریک ندوۃ" کے عنوان سے شروع کیا گیا تھا، اس کے دو سال بعد سنہ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں مشہور عالم دین مولانا سید محمد علی مونگیری (ولادت ۱۸۴۶ء وفات ۱۹۲۷ء) خلیفۂ قدوۃ السالکین مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء) نے اسی تحریک کے زیر اثر شہر لکھنؤ میں "دارالعلوم ندوۃ العلماء" قائم کیا، جہاں سے سینکڑوں علمی و دینی شخصیتیں اپنی تعلیمی فراغت کے بعد عالم گیر شہرت یافتہ بن کر منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئیں۔ ان ہزاروں فارغین میں سے چند مشاہر جنہوں نے اپنی تصنیفات اور علمی و ادبی کاوشوں کے ذریعہ اسلامی دنیا میں اپنا سکہ بٹھایا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: علامہ سید سلیمان ندوی (ولادت ۱۸۸۴ء وفات ۱۹۵۳ء)، مولانا سید ابوالحسن ندوی (ولادت ۱۹۱۳ء وفات ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء)، مولانا مسعود عالم ندوی (۱۹۱۰-۱۹۵۴ء)، مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۳ء-۱۹۵۶ء)، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۰۱ء-۱۹۶۸ء)، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی (متوفی ۱۹۶۸ء)، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (متوفی ۲۰۲۳ء) وغیرہ علماء و فضلاء عالمِ اسلام کو اپنے کارناموں سے متاثر کئے ہوئے ہیں۔

---

[۴] ماخذ سابق، ص: ۱۱-۱۲

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام سنہ ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ اسی سال ذمہ داران ندوہ کی جانب سے آصف جاہی خاندان کے چھٹے فرمانروا نواب میر محبوب علی خاں (عہد ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) کی بارگاہ میں تعاون کی عرضی پیش کی گئی۔ اس پر حکومت کی طرف سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے ماہانہ پچاس (۵۰) روپے اور اس کے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے نام ماہوار پچاس (۵۰) روپے جاری کئے گئے۔ مگر چند ماہ بعد حضرت ناظم کی گزارش پر ان کے لئے مختص رقم بھی ندوہ کے نام منتقل کردی گئی، اس طرح مدرسہ کے لئے مجموعی رقم ایک سو (۱۰۰) روپے کردی گئی۔ یہ سلسلۂ افادہ واستفادہ یوں ہی چلتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں اراکین ندوہ نے اپنے ادارے کا مفصل تعارف کراتے ہوئے آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں (عہد حکومت ۱۹۱۱ء تا ۱۹۴۸ء) کی خدمت میں ایک طویل درخواست پیش کی۔ اس درخواست میں، بقول ڈاکٹر سید داؤد اشرف، دارالعلوم کی اہم ضروریات کے بارے میں اس طرح بتایا گیا:

> دارالعلوم کی عمارت پر نواسی ہزار روپیہ صرف ہوچکا ہے اور ابھی بیالیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ دارالاقامہ کی تجویز ملتوی کردی گئی ہے جس کے لئے ایک لاکھ اسی ہزار روپے درکار ہیں۔ کتب خانہ کرایے کے مکان میں ہے، اس کے لئے موزوں اور مناسب عمارت کی ضرورت ہے۔ ایک مسجد کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ دارالعلوم کے گرد دور دور تک مسجد نہ ہونے سے طلبہ دارالعلوم کے ہال میں نماز پڑھتے ہیں۔ اساتذہ اور ملازمین کے لئے احاطۂ دارالعلوم میں مکانات تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اور طلبہ کے وظائف کے لئے رقم درکار ہے۔ درخواست کے آخر میں لکھا گیا کہ طلبہ کی تعداد میں اضافہ سے ندوۃ العلماء کے ارکان کی مشکلات میں اضافہ ہورہا ہے۔ لیکن وہ دل شکستہ اور مایوس نہیں ہیں۔ انہیں خدا پر بھروسہ ہے اور وہ آصف سابع کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں، جن کی فیاضی اور گہرریزی سے ملک کی قومی اور مذہبی درسگاہیں روز افزوں پروان چڑھ رہی ہیں۔[۵]

اس عرض گزارش کے مدنظر آصف سابع نے بتاریخ یکم رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ / ۱۸ر اپریل ۱۹۲۳ء اپنا فرمان جاری کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کو ماہانہ تین سو (۳۰۰) کلدار روپیہ کی امداد مقرر

---

[۵] ماخذ سابق، ص: ۱۹-۲۰

فرمادی۔ یہ ماہانہ عطیہ مسلسل ندوہ کو حاصل ہوتا رہا۔ اس واقعے کے کئی سال بعد ندوۃ العلماء کے ناظم کی جانب سے ایک اور عریضہ بارگاہ آصف جاہی میں روانہ کیا گیا، جس میں ماہانہ امداد میں اضافے اور پندرہ ہزار روپے قرض کے بوجھ سے گلوخلاصی کرنے کی استدعا کی گئی۔ نواب میر عثمان علی خاں نے اس پر مثبت ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ماہانہ امداد میں اضافہ اور دس ہزار روپے قرض کی ادائیگی کے لئے مؤرخہ ۲؍مارچ ۱۹۴۴ء میں فرمان جاری کردیا۔[۶] اس کے دوسرے ہی سال مولانا سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء نے قرض کی مابقیہ ادائیگی کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کو حیدرآباد روانہ کرتے ہوئے یہ درخواست پیش کی کہ مزید نو ہزار روپے منظور فرمائیں ۔ نواب موصوف نے مذکور تحریر کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے مابقیہ رقم ندوۃ العلماء کے سپرد کرنے کا حکم صادر فرمایا۔[۷]

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے محسنوں میں سے مولانا مودی عبدالغفور[۸] (متوفی ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء) نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ مودی عبدالغفور نہ صرف تحریک خلافت کے قائدین میں سے تھے بلکہ ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن بھی تھے۔ آپ بانیان ندوہ کے سرخیل مولانا شاہ سلیمان پھلواری (متوفی ۱۳۵۴ھ) کے مجاز بیعت و خلیفۂ خاص بھی تھے۔[۹]

ندوۃ العلماء کا سنہ ۱۹۰۴ء میں بمقام مدراس اولین جلسہ منعقد ہوا تھا۔ ندوہ سے متعلق عوام وخواص میں بہت ساری غلط فہمیاں تھیں۔ ان غلط فہمیوں کو علمائے مدراس کے ذہن سے صاف کرتے ہوئے انہیں تحریک ندوہ کا حصہ بنانے کا بیڑا دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان ویلور کے سجادہ نشین شمس العلماء سید شاہ رکن الدین قادری علیہ الرحمہ اور ان کے صاحبزادے سید شاہ عبداللطیف قادری نے اٹھایا۔

---

[۶] ماخذ سابق، ص:۲۱

[۷] ماخذ سابق، ص:۲۲

[۸] لفظ ''مودی'' خاندانی لقب ہے۔ مولانا مودی عبدالغفور کے اجداد دور عادل شاہی میں مخزن اجناس Store Room کے نگران تھے۔ اس دور میں یہ وقیع منصب تھا، اس لئے کہ کھانے پینے میں کوئی غلط چیز شامل ہوجاتی تو سلطان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہونے کا امکان رہتا تھا۔ اس عہد میں نگرانی کرنے والے کو ''مودی'' کہا جاتا تھا۔ ''مودی'' گجراتی لفظ ہے جو مراٹھی سے آیا ہے جس کے معنی اجناس کا محافظ ہے۔

[۹] غلام حسین سلیمانی ندوی سید شاہ ابن مولانا سید شاہ سلیمان پھلواری، خاتم سلیمانی، ۱۹۳۶ء، ص:۱۵۱

علاوہ ازیں ہندوستان کے اولین مدرسہ جامعہ باقیات صالحات، ویلور کے مؤسس و بانی علامہ شمس العلماء عبدالوہاب قادری نقشبندیؒ (۱۲۴۸ھ۔۱۳۳۷ھ) اوران کے فرزند علامہ قاری ضیاء الدین محمد قادری باقویؒ (متوفی ۱۹۴۱ء) رکن رکین مجلس شوریٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے شہر اور اس کے اطراف کے ماحول کو ذمہ دارانِ ندوہ کے موافق و معاون بنانے کے لئے اپنے اثرو رسوخ کا خوب استعمال کیا۔ ان سارے اکابر کی مخلصانہ تگ و دو کے بعد حالات معمول پر آئے اور سہ روزہ کامیاب اجلاس کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

پھر ایک مدت بعد شہر مدراس میں ندوۃ العلماء کا اجلاس شانزدہم (۱۶) بتاریخ ۱۰/ اپریل ۱۹۱۷ء منعقد ہوا۔ اس میں مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ اس موقع پر تجویز نمبر ۹ پیش کرتے ہوئے مولانا مودی عبدالغفور نے فرمایا: یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری کی خدمات کے اعتراف میں "وظائف سلیمانی" کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا جائے، جس سے غیر مستطیع طلبہ کو دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف دیے جائیں۔ مولوی غلام محمد صاحب نے پُر اثر طریقے سے اس تجویز کی تائید کی۔

تحریک کی تائید کے بعد خود مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب (متوفی ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) ایستادہ ہوئے اور آپ نے یہ ترمیم پیش کی کہ اس فنڈ کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے انتساب سے "وظائف محمدیہ" رکھا جائے۔ تحریک کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب نے پانچ (۵۰۰) سو روپے نقد اور سو (۱۰۰) روپے سالانہ کا اعلان کیا۔[۱۰]

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خیر خواہوں میں ڈاکٹر عبدالحق کرنولی (متوفی ۱۹۵۸ء) کا اسم گرامی نمایاں اور روشن ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق سلسلۂ نظامیہ کے جید عالم ہونے کے علاوہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے پروفیسر ڈی۔ ایس۔ مار گولیوتھ (D.S. Margoliouth) کی نگرانی میں عربی کے مایہ ناز شاعر "ہبۃ اللہ بن سناء الملک" کے دیوان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل (D. Phil) کی اعلیٰ سند حاصل کر چکے تھے۔ آپ کو حکومت وقت نے ۱۹۴۴ء میں خان بہادر کے خطاب سے نوازا تھا۔

---

[۱۰] راہی فدائی، جنوب کے اصحاب کمال (حصۂ دوم) الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد، ۲۰۱۹ء۔ ص: ۲۵۴۔۲۵۵

آپ کی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دور ابتلا میں پرووائس چانسلر نامزد کر کے علی گڑھ روانہ کیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق ابن شمس العلماء مولانا محمد عمر صاحب (متوفی ۱۹۴۶ء) نے اپنے مخلص دوست ملک التجار الحاج جمال محمد راؤتر (متوفی ۱۹۴۹ء) کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ علامہ سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) کو سیرتِ طیبہ پر خطبات دینے کے لئے مدراس تشریف لانے کی دعوت دیں اور اس سلسلے کے تمام اخراجات برداشت کریں۔ چنانچہ حسب منشایہ کام ہو گیا، اور ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں علامہ نے سیرت طیبہ پر معرکہ آرا خطبات پیش کئے جو بعد میں "خطبات مدراس" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئے۔[11] ڈاکٹر عبدالحق کے لازوال کارناموں میں سے یہ بھی ایک ہے کہ سنہ ۱۹۲۷ء میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ (قائم شدہ ۱۹۲۰ء) کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز تھے، جامعہ پر بہت برا وقت آیا اور وہ بے انتہا قرضوں میں ڈوب گئی۔ یہ صورت حال ابوالکلام آزاد کے علم میں لائی گئی تو انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو مدراس روانہ کیا اور ڈاکٹر عبدالحق سے مشورہ کرنے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ذاکر حسین صاحب کو نہ صرف اپنا مہمان بنایا بلکہ اپنے کرم فرما دوست الحاج جمال محمد راؤتر سے ذاکر حسین صاحب کا تعارف کرا کے ایک خطیر رقم دلوائی جس سے جامعہ ملیہ کا قرض مکمل طور پر ادا ہو گیا[12] اور بینک میں رقم ڈپازٹ کے طور پر رکھنے کی صورت پیدا ہوئی۔

اس موقع پر علامہ سید سلیمان ندوی کا درج ذیل بیان دار العلوم ندوۃ العلماء اور اکابرین مدراس کے مستحکم روابط کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

> آخر میں اپنے دو حریف فن افضل العلماء پروفیسر عبدالحق ایم۔اے، اور شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاطرؔ مصنف "اعجاز عشق" کی مہربانیوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ مسافر نوازی کا حق ادا کیا۔

ایم جمال محمد (راؤتر) صاحب جو ان خطبات کے اصل محرک تھے، وہ مدراس کے ایک روشن خیال،

---

[11] راہی فدائی، تذکرہ محدثین جنوب، ۲۰۲۰ء۔ ص:۱۲۶۔۱۲۷

[12] اقبال احمد، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کی تعلیمی اور اردو خدمات، ڈاکٹر محمد عبدالحق ایجوکیشنل اکیڈمی، کرنول، ۱۹۹۵ء، ص:۲۸۸۔۲۹۷

شریف اخلاق، فیاض اور حد درجہ متواضع تاجر ہیں۔ دیگر متفرق عطیوں کے علاوہ سترہ سو ماہوار صرف تعلیمی درس گاہوں پر اپنے پاس سے صرف کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری تحریک پر انہوں نے پچاس روپے ماہوار بمد وظائف، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے بھی مقرر کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ خیراً۔ ارکان ندوہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔

مدراس نے ہمیشہ ندوۃ العلماء کی مدد کی ہے۔ دارالاقامہ کی مد میں بھی اس نے کچھ دیا ہے۔ مگر اس سفر کے معاوضے میں "دارالعلوم" میں مسجد کی تعمیر کا خرچ احباب مدراس سے وصول کر کے چھوڑوں گا۔ ہمارے مخلص کرم فرما حاجی جلال عبدالکریم صاحب (متوفی ۱۹۳۹ء) کو اپنا وعدہ یاد رکھنا چاہئے۔ (نواب) سی، عبدالحکیم صاحب (متوفی ۱۹۳۸ء) سے بھی امید ہے کہ وہ اپنے ایک ہزار کا وعدہ فراموش نہ کریں گے۔[۱۳]

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی امداد و نصرت دامے درمے سخنے ہر اعتبار سے مدراس کے اصحاب خیر نے کی، حتیٰ کہ مدراس کی خواتین بھی اس معاملہ میں مردوں سے پیچھے نہیں رہیں، چنانچہ ماہنامہ "الندوہ" ۱۹ر جون جلد نمبر ۶ کے آخری صفحے پر "پچاس عطیات دہندہ از خواتین مدراس بابت تعمیر دارالاقامہ دارالعلوم ندوۃ العلماء تحریر شدہ ہے۔

عالم اسلام کی پُرعظمت و پروقار دینی درسگاہ، جامعہ نظامیہ، حیدرآباد (دکن) اپنے مؤسس و بانی فضیلت جنگ علامہ محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ (۱۲۶۵ھ /۱۸۴۸ء۔۱۳۳۶ھ /۱۹۱۷ء) کی لازوال و بے مثال یادگار ہے، آپ جید عالم دین و مفتیٔ شرع متین ہونے کے علاوہ امام العارفین حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) کے مجاز بیعت و خلیفۂ خاص تھے۔ حضرت فضیلت جنگ نے حیدرآباد کی وسیع و عریض ریاست کے دینی و علمی زوال کے پیش نظر صرف ستائیس (۲۷) سال کی عمر میں اپنے دست مبارک سے سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مدرسے کی بنیاد رکھی جو آگے ترقی کرتا ہوا جامعہ (یونیورسٹی) کی صورت اختیار کر گیا۔ جامعہ نظامیہ کے سند یافتہ فارغین کی تعداد ایک محتاط اعداد و شمار کے مطابق تین لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس جامعہ کے اسناد مشہور جامعات مثلاً عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،

---

[۱۳] ماہنامہ "معارف" ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ نومبر ۱۹۲۵ء۔ نمبر ۵، جلد ۱۶، ص: ۳۲۲۔۳۲۴

حیدرآباد، انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی حیدرآباد، کے علاوہ بیرون ملک کی یونیورسٹیوں مثلاً ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ، اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ، جامعہ ازہر مصر، امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض وغیرہ میں تسلیم شدہ ہیں۔[۱۴] یہ خصوصیت ہندوپاک کی کسی بھی دینی درسگاہ کو حاصل نہیں ہے۔ جامعہ نظامیہ کا قیام آصف جاہ پنجم نواب افضل الدولہ کے دور حکومت (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۴ء) کی آخری دہائی میں عمل پذیر ہوا تھا۔ بعد ازاں بانی نظامیہ علیہ الرحمہ کے بلند کردار اور شیرینیٔ گفتار اور آپ کے علم وعمل اور آپ کے تقویٰ وطہارت سے متاثر ہو کر آصف جاہ ششم نواب میر محبوب علی خاں (عہد ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۱ء) نے آپ کو اپنا اتالیق بنالیا۔ میر محبوب علی خاں کی وفات کے بعد آصف ہفتم نواب میر عثمان علی خاں (عہد ۱۹۱۱ء تا ۱۹۴۸ء) نے بھی آپ کو بصد عزت واحترام اپنا مربی ومعلم تسلیم کرنے کے علاوہ آپ کو اپنے دونوں فرزندوں نواب اعظم جاہ اور نواب معظم جاہ کا استاذ مقرر کیا اور فضیلت جنگ کے خطاب کے ساتھ ناظم امور مذہبی، صدر الصدور اور وزیر امور مذہبی کے اعلیٰ مناصب پر فائز فرمایا۔ ان سب اعزازات کے باوجود آپ نے اپنے قائم کردہ جامعہ میں خود بھی تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ وزیر امور مذہبی کی حیثیت سے آپ نے حکمران سلطنت میر عثمان علی خاں کی اس طرح عمدہ رہنمائی کی جس کی وجہ سے نواب آصف جاہ ہفتم نے تعلیمی اداروں، دینی مدرسوں اور رفاہی امور کے لئے اپنا فیاضانہ سلوک بے کم وکاست باقی رکھا۔

علاوہ ازیں آصف ہفتم میر عثمان علی خاں نے اپنے استاذ کے مدرسہ کے لئے ماہانہ دو ہزار روپے کی امداد منظور کرتے ہوئے مؤرخہ ۴؍مئی ۱۹۱۲ء فرمان جاری فرمایا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) سے پیشتر جاری کردہ اس رقم کی قدر وقیمت آج کے روپیوں کے اعتبار سے کس قدر ہوگی، کوئی ماہر مالیات ہی بتاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ نواب موصوف نے مدرسے کے مستحق طلبہ کے لئے ماہانہ پچیس پچیس (۲۵) روپے کے وظیفے بھی اپنے کرم فرما استاذ کے نام سے اجرا فرمایا۔ ابتدا میں مدرسہ ایک اصطبل کے کنارے شروع کیا گیا تھا۔ چونکہ آصف سابع کو اس مدرسے سے خاص لگاؤ تھا اس لئے نواب صاحب نے مؤرخہ ۱۹؍شوال ۱۳۳۶ھ /۲۸؍جولائی ۱۹۱۸ء ایک فرمان جاری کرتے ہوئے حکم دیا کہ

---

[۱۴] حیدرآباد کی علمی فیض رسانی، ص: ۲۷

اصطبل کو منہدم کر کے اسی مقام پر بیس ہزار کی لاگت سے مدرسے کی نئی عمارت تعمیر کی جائے۔[۱۵] اس کے علاوہ مدرسے کی ضروریات سے متعلق آصف سابع کو جب بھی آگاہی ہوتی، تو وہ بلا تاخیر پوری کی جاتی۔

برصغیر ہندوپاک کا عظیم الشان علمی و دینی اور تصنیفی و اشاعتی ادارہ ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' (قائم شدہ ۱۹۱۴ء) زائد از صدی مسلسل فعّال و متحرک ہے، ہند اور بیرونِ ہند کے کسی اور ادارے کو اس قدر وقار واعتبار حاصل نہیں ہوا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷۔ ۱۹۱۴ء) کا قائم کردہ اور ان کے عزیزترین شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔ ۱۹۵۳ء) کے خون جگر سے سینچا ہوا یہ چمن گرم و سرد ہواؤں اور برق وباراں کے تھپیڑوں کے باوجود تا حال لہلہاتا ہوا سر سبز و شاداب اور شگفتہ و تر و تازہ ہے۔ دارالمصنّفین سے بلا ناغہ تسلسل کے ساتھ شائع ہونے والا علمی و تحقیقی ماہنامہ ''معارف'' اپنے بلند معیار اور مستند قلم کاروں کی کاوشوں کی وجہ سے علمی دنیا میں خوب متعارف ہے۔

آصف سادس میر محبوب علی خاں کے عہد (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) میں علامہ شبلی نعمانی کے نام وظیفۂ تصنیفی ہر ماہ ایک سو کلدار روپے جاری ہوئے تھے۔ علامہ شبلی نے بہ عہد آصف سابع میر عثمان علی خاں سنہ ۱۹۱۳ء میں وظیفے میں اضافہ کے لئے استدعا کی تھی جو بتاریخ ۱۳/ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ / ۱۴/ اکتوبر ۱۹۱۳ء منظور کر لی گئی۔ اس کے نتیجے میں علامہ شبلی کا وظیفہ تین سو روپیہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ رقم علامہ کی وفات ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد بھی ۳/ صفر ۱۳۳۳ھ / ۱۷/ جنوری ۱۹۱۵ء تک جاری رہی۔ پھر علامہ مرحوم کے فرزند ارجمند حامد نعمانی کی درخواست پر مذکورہ رقم علامہ کے قائم کردہ ادارہ ''دارالمصنفین'' کو منتقل کر دی گئی۔ ماہانہ تین (۳۰۰) سو روپے کی یہ رقم دارالمصنفین کو ۱۲/ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ / ۲۸/ اپریل ۱۹۱۵ء سے آصف سابع کی حکومت کے اختتام سنہ ۱۹۴۸ء تک اور ریاست حیدر آباد کو حکومت ہند میں ضم کرنے تک کم و بیش تینتیس (۳۳) سال جاری رہی حالانکہ اس دوران ریاست کے انگریز نگران ''ریزیڈنٹ'' نے بار بار شکایت کی کہ دارالمصنفین اپنے بانی کے منشا اور اغراض کو نظر انداز کر رہا ہے اور یہاں سیاسی کارروائیاں جاری ہیں، مزید یہ کہ باغیانہ نوعیت کی تحریریں بھی

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص: ۳۰

یہاں سے شائع ہو رہی ہیں۔[۱۶] آصف سابع نے ان اعتراضات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے "دارالمصنفین" کی امداد برابر جاری رکھی۔ یہ غیر معمولی واقعہ نواب میر عثمان علی خاں کی جرأت و ہمت، دینی حمیت اور علمی قدردانی کی واضح دلیل ہے۔

انہیں اعتراضات و شکایات کے درمیان علامہ سلیمان ندوی کو "سیرۃ النبیؐ" کی تصنیف و تالیف پر ماہانہ دو سو کلدار آصف سابع نے اپنے فرمان مؤرخہ ۷/ جمادی الاول ۱۳۳۷ھ / ۹/ فروری ۱۹۱۹ء کے ذریعے منظور فرمایا۔ یہ سلسلہ ۱۴ سال تک جاری رہا۔ علاوہ ازیں علامہ سید سلیمان ندوی کے ذاتی خرچ کے لئے مزید ایک سو روپے ماہانہ پیش کرنے کا حکم صادر فرمایا۔[۱۷] ریاست حیدرآباد اور اس کے حکمرانوں کی علمی قدردانیاں اور غیر معمولی فیاضیاں تاریخ کے صفحات پر زریں حروف میں رقم کرنے اور انھیں اپنے حافظے کا حصہ بنانے کے قابل ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید داؤد اشرف:

> سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل کے لئے مالی امداد جاری کئے جانے کے سلسلے میں آصف سابع کا جو پہلا فرمان مؤرخہ ۲۷/ جمادی الاول ۱۳۳۷ھ صادر ہوا تھا، اس میں یہ حکم بھی شامل تھا کہ اس کتاب کے پچیس پچیس نسخے مدارس کے لئے خریدے جائیں......
>
> ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سلیمان ندوی نے اپنی زندگی کے بڑے اور بیش قیمت حصے کی تحقیقی، علمی اور ادبی کاوشوں کا جو نچوڑ اپنی تمام تر تحقیقی اور وجدانی کیفیات کے ساتھ "سیرت النبی" کی سات جلدوں میں سمویا ہے، وہ شاید ممکن نہ ہوتا اگر ریاست حیدرآباد کی جانب سے چودہ (۱۴) سالہ اس پروجکٹ کی مالی اعانت نہ کی جاتی۔ نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے علمی کارناموں میں ان کا یہ کارنامہ یقیناً یاد رکھا جائے گا۔[۱۸]

حاصل کلام یہ کہ افادہ اور استفادہ کی یہ شکلیں محققین کے لئے نئی فکر اور نئی جہت کی تلاش میں ان شاءاللہ مدد و معاون ثابت ہوں گی۔

---

(۱۶) سید داؤد اشرف ڈاکٹر، بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۰۳

(۱۷) ماخذ سابق، ص: ۲۱۰

(۱۸) ماخذ سابق، ص: ۲۱۰

شبلی کی علمی اور ملی خدمات

(ملکی انجمنوں کے حوالہ سے)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
azmi408@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی(۱۸۵۷-۱۹۱۴) گو اپنی ذات میں خود ایک بزم وانجمن اورادارہ تھے، تاہم ان کا مزاج افہام وتفہیم اور باہم مشورے سے کام کرنے اور کرانے کا تھا۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے مختلف علمی وادبی، دینی وملی اور سیاسی ومعاشرتی منصوبوں کا اخبارات ورسائل میں باقاعدہ اعلان کیااور قوم کے مدبروں اور دانشوروں سے مشورے طلب کئے تاکہ ایک متحدہ اور مشترکہ لائحۂ عمل تیار ہوسکے اور باہم مشورہ سے کام کیاجاسکے۔یہی سبب ہے کہ جب وہ نامور فرماں روایان اسلام لکھ رہے تھے تو سلسلہ ناموروزرائے اسلام کے تحت "البرامکہ" کے لکھنے میں انہوں نے مولوی عبدالرزاق کانپوری (۱۸۶۲- ۱۹۴۸) کی پوری پوری مدد کی، جیساکہ مصنف مرحوم نے کتاب "البرامکہ" کے دیباچے اور اس کے انتساب میں جو علامہ شبلی ہی کے نام ہے، میں صراحت کی ہے۔اس نوع کی اور بھی متعدد مثالیں اور واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مدینہ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں بھی علامہ شبلی نے یہی طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔اس نوع کے بعض دیگر واقعات کی تفصیلات ناچیز کی کتاب "اثرات شبلی" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

علامہ شبلی کا ہندوستان کی مختلف انجمنوں اور علمی وادبی اور تعلیمی اداروں سے تعلق تھا اور وہ ان کے کاموں میں نہ صرف ذوق وشوق بلکہ ضرورت کے تحت بھی حصہ لے کر علم وادب اور دین وملت کی خدمات انجام دیتے تھے، لیکن ان میں بھی حفظ مراتب کا انہوں نے خیال رکھا اور وہ ملک وملت کے معاصر حالات میں جو کچھ کرسکتے تھے اس سے کبھی دریغ نہیں کیا۔زیرنظر مقالے میں اس کا ایک سرسری خاکہ پیش کیاجاتا ہے۔

انجمن الفرض علی گڑھ: انجمن الفرض، ایم اے او کالج علی گڑھ کے چند طلبہ نے کالج کی فلاح

وبہبودی کے لئے قائم کی تھی۔اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کالج کے نادار اور غریب طلبہ کے لئے مختلف ذرائع سے پیسہ اکٹھا کیا جائے اور ان کا تعاون کیا جائے۔انجمن الفرض نے اپنی ترقی کے لئے مختلف ذرائع پیدا کئے۔مثلاً ایک ذریعہ یہ تھا کہ ایک بک ڈپو قائم کیا گیا۔علامہ شبلی کے ایک دوست ماسٹر میر ولایت حسین اس کے ذمہ دار مقرر ہوئے۔انہوں نے بک ڈپو کو بڑی مستعدی سے چلایا اور اس میں اس وقت کے بڑے اہل قلم اور مصنّفین مثلاً سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی، محمد حسین آزاد اور منشی محمد ذکاءاللہ وغیرہ کی اکثر تصانیف اور رسائل برائے فروخت یکجا کئے، جس سے انجمن کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔حامد نعمانی کے نام علامہ شبلی کے نو دریافت خطوط سے معلوم ہوا کہ علامہ شبلی کی بعض ذاتی تالیفات مثلاً انٹرنس کورس فارسی، انٹر میڈیٹ کورس فارسی اور بی اے کورس بھی یہیں سے فروخت ہوتی تھیں۔[۱] علامہ شبلی نعمانی نے انجمن کے تعاون کی نیت سے اپنی بیشتر تصانیف بک ڈپو کو دیدی تھیں۔انجمن الفرض کی فہرست میں علامہ شبلی کے درج ذیل کتب و رسائل شامل ہیں:

المامون، المعتزلہ والاعتزال، رسائل شبلی، کتاب خانۂ اسکندریہ، انٹرنس کورس فارسی، انٹر میڈیٹ کورس فارسی، بی اے کورس فارسی، صبح امید، سیرۃ النعمان، الفاروق، الجزیہ، الجزیہ ترجمہ انگریزی، سفر نامۂ روم و مصر و شام، بدء الاسلام، بدء الاسلام ترجمہ فارسی از مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) وغیرہ۔

انجمن کی ایک سالانہ روداد میں جو ۱۹۰۴ء کی ہے، جن بزرگوں کے تعاون کا ذکر ہے اس میں علامہ شبلی کا بھی نام درج ہے۔اس موقع پر انجمن کی حمایت اور تعاون کے لئے جو تقریریں ہوئیں یا تقریبات میں نظمیں پڑھی گئیں ان میں بھی علامہ شبلی کا نام شامل ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے نہایت قابلانہ تقریر کی۔[۲]

انجمن اسلامیہ امرتسر: انجمن اسلامیہ امرتسر کا قیام ۱۸۷۳ء میں عمل میں آیا تھا۔ہندوستان کی انجمنوں میں یہ ایک نہایت اہم، وقیع اور قابل ذکر انجمن تھی۔ اس کی اپنی ایک طویل

---

[۱] محمد الیاس الاعظمی، مکتوبات شبلی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۲۱ء، ص: ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۸۵ وغیرہ

[۲] انجمن الفرض کا بک ڈپو، مطبع العلوم پریس علی گڑھ، س ن، ص ۵-۶

تاریخ ہے، جسے ممتاز مصنف پروفیسر احمد سعید (۱۹۴۲ء-۲۰۲۱ء) نے قلم بند کیا ہے۔[۳] اس میں ۱۸۷۳ء- ۱۹۵۷ء تک کی تاریخ ہے۔ اس کے منتظمین سے بھی علامہ شبلی کی قربت تھی، چنانچہ انہوں نے اس کے پروگراموں میں شرکت کی اور منتظمین کا تعاون کیا۔

سنہ ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلما کے قیام سے ہی انجمن اسلامیہ امرتسر کے ذمہ داروں نے اس سے پوری دلچسپی لی اور اس کے اغراض و مقاصد کی تائید و حمایت کی اور مالی تعاون بھی کئے اور کرائے۔ انجمن نے امرتسر میں ندوہ کے دو اجلاس بھی منعقد کرائے۔ پہلا اجلاس ۱۹۰۲ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں علامہ شبلی شریک تھے۔ یہ جلسہ ۹ تا ۱۱/ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ہوا تھا۔ اس دن کئی علما کی تقریریں اور وعظ و خطابات ہوئے۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے ایک فارسی ترکیب بند بڑے پر جوش انداز میں پیش کیا۔ ان کے شوق وذوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ترکیب بند انہوں نے نہایت خوب صورت کتابچہ کی صورت میں طبع اور تقسیم کرایا تھا۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ یہ ترکیب بند کلیات شبلی فارسی میں شامل ہے۔

علامہ شبلی ندوہ کی مالی ضروریات کے لئے اکثر و بیشتر سفر کیا کرتے تھے۔ کبھی اکیلے اور کبھی وفد کے ساتھ۔ ۱۹۰۶ء میں وہ ایک وفد لے کر امرتسر گئے۔ ان کے ساتھ وفد میں مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹-۱۹۳۵) اور بابو نظام الدین (م: ۹ مارچ ۱۹۲۲ء) شامل تھے۔ اس موقع پر اسلامیہ اسکول امرتسر میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ عمدہ تقریریں ہوئیں اور تعاون کے لئے چندہ بھی کیا گیا۔

انجمن اسلامیہ امرتسر کے سکریٹری شیخ غلام صادق (۱۸۵۳-۱۹۲۱) کے صاحبزادے شیخ صادق حسن (۱۸۸۸-۱۹۵۹ء) نے بی اے میں کامیابی حاصل کی تو شیخ غلام صادق نے ۲۵ روپے اس خوشی میں ندوہ کی نذر کئے۔ علامہ شبلی نے اس نذرانے کا ذکر ماہنامہ الندوہ کے شذرات میں کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ہم مختلف ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں، لیکن شیخ صاحب نے ہمارے اس فرض کو اور بھی اس طرح لازمی کر دیا ہے کہ انہوں نے بطور شکریہ کے ۲۵ روپے

---

(۳) پروفیسر احمد سعید، انجمن اسلامیہ امرتسر، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

دارالعلوم کے لئے بھیجے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ صاحبزادۂ موصوف ایم اے میں بھی کامیابی حاصل کریں تاکہ شیخ صاحب کا خاندان دولت اور علم دونوں کا جامع ہو۔[۴]

انجمن اسلامیہ امرتسر کے سکریٹری شیخ صادق کی شبلی وندوہ سے دلچسپی کا حال اوپر گذرا اور انجمن کے اسسٹنٹ سکریٹری بابو نظام الدین صاحب کا بھی حال سنئے۔ ۱۹۰۷ء میں ایک شخص جس کا نام عبدالوہاب تھا، اس کی شادی کے موقع پر کان پور کے محمد حلیم سوداگر نے پچاس روپئے بابو نظام الدین کے نذر کئے۔ بابو نظام الدین نے یہ رقم ندوہ کو بھیج دی۔ علامہ شبلی نے خوش ہو کر اس کا بھی ذکر ماہنامہ الندوہ کے شذرات میں کیا اور لکھا کہ:

اگر تمام ارکان ندوہ اس کا خیال رکھیں تو ندوۃ العلماء اپنے مقاصد میں بہت جلد کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ بابو نظام الدین کی یہ تحریک نئی نہیں ہے، ہم ہمیشہ سے ان کی توجہ اور عنایت کے شکر گذار ہیں اور امید ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ ندوۃ العلماء کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔[۵]

انجمن اسلامیہ امرتسر کے عہدہ داروں نے ندوہ کا بڑا تعاون کیا اور اس کے لئے برابر فکر مند رہے۔ اس کی کچھ تفصیل پروفیسر احمد سعید مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھی ہے:

ندوۃ العلماء کی جو رودادیں دستیاب ہو سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ غلام صادق صدر انجمن اسلامیہ امرتسر، بابو نظام الدین اسسٹنٹ سیکریٹری انجمن اسلامیہ باقاعدگی سے ندوہ کو چندہ فراہم کرتے رہے، مثلاً شیخ غلام صادق نے ۱۹۰۵ء میں ۱۰۰ روپئے اور ۱۹۰۶ء میں ۱۵۰ روپئے، ۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو ۳۰ روپئے، ۱۹۱۲ء میں پانچ روپئے چندہ میں دیے، اسی طرح بابو نظام الدین نے ۱۹۰۶ء میں ۱۰۰ روپئے، ۱۹۱۲ء میں ۵ روپئے اور ندوۃ العلماء کی عمارت کی تکمیل کے لئے سو روپئے چندہ دیا۔[۶]

سنہ ۱۹۰۷ء میں انجمن اسلامیہ کے سیکریٹری شیخ غلام صادق ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن

---

[۴] الندوہ، لکھنو، مئی ۱۹۰۸ء، ص: ۲

[۵] الندوہ، جنوری ۱۹۰۸ء، ص: ۴

[۶] ماہنامہ الندوہ لکھنو، مئی، جون ۱۹۰۶

نامزد ہوئے۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے ان کا ذکر شذرات الندوہ میں ان الفاظ میں کیا:

خان بہادر شیخ غلام صادق رئیس امرتسر ان لوگوں میں ہیں جو قومی انجمنوں کے ساتھ اور خصوصاً ندوۃ العلماء کے ساتھ ایک خاص قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں، ہم کو امید ہے کہ خان بہادر کی ندوۃ العلماء کی طرف ادنی توجہ ندوہ کی سرسبزی کا باعث ہوگی۔[7]

علامہ شبلی کی زندگی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ انجمن وقف علی الاولاد کا قیام اور اس کی کامیابی کے لئے چار سالہ جدوجہد بھی ہے، جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔ انجمن اسلامیہ امرتسر نے علامہ شبلی کی انجمن وقف علی الاولاد کی نہ صرف تائید کی بلکہ بھرپور تعاون بھی کیا۔ وقف علی الاولاد کا قانون منظور کرانے کی جدوجہد میں ایک اندازے کے مطابق چار ہزار روپئے کا صرفہ تھا، چنانچہ اس مد میں انجمن اسلامیہ کے سکریٹری نے سو روپئے اپنی جانب سے اور سو روپئے انجمن کی جانب سے چندے کے طور پر ادا کئے۔

محمد علی جناح (۱۸۷۶-۱۹۴۸) نے وقف علی الاولاد بل اسمبلی اراکین کے سامنے پیش کیا جو منظور ہوا مگر اس میں کچھ کمیاں رہ گئی تھیں، جنہیں درست کرانے کے لئے علامہ شبلی بمبئی جاکر محمد علی جناح سے ملے اور اپنا موقف پیش کیا۔ انجمن اسلامیہ امرتسر نے ایک اجلاس منعقد کر کے محمد علی جناح کے بل پیش کرنے کی حمایت کی اور پھر علامہ شبلی کے موقف کے مطابق اصلاح و تصحیح کی بھی قرارداد منظور کی۔

۱۹۰۸ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس امرتسر میں انجمن اسلامیہ نے بڑا تعاون کیا بلکہ انہی کے تعاون سے اجلاس کامیاب رہا۔ علامہ شبلی نے بھی ۲۷/ دسمبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں شرکت کی اور "حقوق نسواں" کے موضوع پر ایک نہایت پر مغز تقریر کی۔ یہ تقریر ناچیز کے مرتبہ "کلیات خطبات شبلی" میں شامل ہے۔ اور واقعی اپنے موضوع پر نہایت عالمانہ اور محققانہ خطبہ ہے۔ اس موضوع پر تقریروں اور تحریروں کا اردو میں ایک انبار ہے تاہم بلا شائبہ مبالغہ علامہ شبلی کا خطبہ بے نظیر ہے۔

انجمن حمایت اسلام: انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام ستمبر ۱۸۸۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس کا

---

[7] شذرات، الندوہ، لکھنو، نومبر ۱۹۰۷

بنیادی مقصد حمایت اسلام اور دفاع اسلام تھا، تاہم مسلمانوں کی تعلیمی بیداری اور جدید شعور کے فروغ میں بھی اس انجمن نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے ہماری علمی، ادبی، تعلیمی اور ملی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان جلسوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سر سید احمد خاں، مولوی نذیر احمد دہلوی، مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، سر محمد شفیع بیرسٹر، مرزا ارشد گورگانی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی اور مولوی عبد الحق حقانی جیسے اساطین اور مشاہیر علم و فن نے شرکت کی اور اپنے علم و فضل سے مستفید فرمایا۔ علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) تو انجمن کے خاص شعرا میں تھے۔ انہوں نے فروری ۱۹۰۰ء میں پہلی بار شرکت کی اور اپنی مشہور نظم نالۂ یتیم پیش کی۔ ان کی کئی اہم نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، فریاد امت، تصویر درد، شمع اور شاعر، طلوع اسلام اور خضر راہ وغیرہ اولاً انجمن حمایت اسلام لاہور ہی کے جلسوں میں پڑھی گئیں۔

علامہ شبلی نے اپنی علمی زندگی کا مقصد آغاز ہی سے حمایت اسلام اور دفاع اسلام قرار دیدیا تھا، چنانچہ وہ تاحیات ان کاموں میں منہمک اور نہایت سرگرم رہے۔ ان کے ابتدائی دور کے تاریخی اور تحقیقی مقالات اور ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات دراصل اسی فکر و خیال کا حصہ ہیں۔ اخیر دور میں تو باقاعدہ انجمن حفاظت و اشاعت قائم کرکے بڑے پیمانہ پر جدوجہد کی۔ چونکہ انجمن حمایت اسلام کے بنیادی موضوع سے فکر شبلی ہم آہنگ تھی اس لئے وہ اس سے کیسے دور رہ سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے کئی اجلاسوں میں شرکت کی مگر اس کی تفصیل سے حیات شبلی ہی نہیں ان پر لکھی جانے والی دوسری کتب کے اوراق بھی خالی ہیں۔

علامہ شبلی مارچ ۱۸۹۵ء میں پہلی بار سر سید کے ساتھ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں شریک ہوئے۔ اس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ اس کے بعد انجمن کے ۱۹۰۳ء کے سالانہ جلسے میں علامہ شبلی نے شرکت کی اور "الاسلام" کے عنوان سے نہایت مفصل خطبہ دیا جو انجمن کی روداد میں چھپا ہے اور اسی سے مجلہ صحیفہ لاہور نے جنوری ۱۹۷۱ء میں نقل کیا ہے۔ انجمن کی روداد کے مرتب مولوی عبد الکریم کے مطابق یہ خطبہ تحریری تھا۔ اس وجہ سے نقل نویسوں نے اسے نقل نہیں کیا لیکن علامہ شبلی نے تحریری خطبہ کے بعد بھی خطاب جاری رکھا اور اس وجہ سے آخر کا کچھ حصہ شامل ہونے سے رہ گیا۔ بہر حال یہ ایک مفصل خطبہ ہے اور اب "کلیات خطبات شبلی" میں

شامل ہے۔ اس کے ذیلی عناوین درج ذیل ہیں:

۱. مذہب انسان کی فطرت میں شامل ہے

۲. مذہب اسلام

۳. عقل اور مذہب

۴. دین و دنیا یا جسمانیات اور روحانیات کا باہمی تعلق اور اس کا موازنہ

ان ذیلی عناوین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ خطبہ کس درجہ عالمانہ اور محققانہ ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے پہلے ثابت کیا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے اور انسان اس کے بغیر زندگی گذار ہی نہیں سکتا۔ پھر اسلام کی عظمت بیان کی۔ عقلی اور نقلی امور کو الگ الگ واضح کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خطبے میں اسلام کی حقانیت بڑے خوب صورت اور مدلل انداز میں ثابت کی گئی ہے۔ بعد ازاں مذہب اور عقلیات کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں اوّلاً مذاہب میں عقلیات کی حیثیت واضح کی گئی ہے اور کسی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "دنیا میں آج جس قدر مذاہب موجود ہیں ان سب میں یقین کی ابتدا اس حکم سے شروع ہوئی ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو"۔ (۸)

اس قول کو علامہ شبلی نے جابرانہ حکم سے تعبیر کرنے کے بعد اسلام اور عقل کے موضوع پر انتہائی بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور قرآن واحادیث سے متعدد دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک سائنٹفک مذہب ہے۔ لا اکراہ فی الدین سے بھی استدلال کیا ہے اور اس کے معنی ومفہوم کی بھی وضاحت کی ہے۔ آخر میں جسمانیات اور روحانیات کے باہمی تعلق کی وضاحت کی ہے۔ ان کا موازنہ بھی کیا ہے اور پوری بحث میں کثرت سے قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے۔ بعض فرق اسلامی کا بھی اس میں ضمناً ذکر آگیا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ "غرض خواہ نفس مذہب، بالخصوص مذہب اسلام، خواہ خاص خاص اسلامی عقائد جس چیز پر یقین دلانا چاہا ساتھ ہی دلیل بھی بیان کی۔ ایک جگہ نہیں کہا کہ ان عقائد کو بلا دلیل تسلیم کرو"۔ (۹)

اپنے موضوع، انداز خطابت اور مسکت دلائل وبراہین کے نقطۂ نظر سے علامہ شبلی کا یہ خطبہ بڑا

---

(۸) نوادرات شبلی، محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص ۸۸

(۹) ماخذ سابق، ص: ۸۹

عالمانہ اور محققانہ ہے اور حقیقت میں خطبہ سے زیادہ مقالہ معلوم ہوتا ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے اس اجلاس میں علامہ اقبال شریک تھے اوراپنی مشہور نظم "فریاد امت" اسی موقع پر پیش کی تھی۔اسی موقع پر ملت کے دونوں حدی خوانوں شبلی واقبال میں پہلی بار ملاقات بھی ہوئی۔یقین ہے کہ اسی موقع پر علامہ اقبال کی کتاب "علم الاقتصاد" کے ایک حصے کی زبان وبیان کی اصلاح بھی علامہ شبلی نے کی، جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنی کتاب کے دیباچے میں صراحت کی ہے۔ ان بزرگوں کی ملاقات کے مختلف سنین کا ذکر اہل علم وقلم نے کیاہے، مگراب ۱۹۰۳ء کی انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں دونوں بزرگوں کی شرکت اور اسی زمانہ میں "علم الاقتصاد" کی زبان کی اصلاح سے یہ رائے پختہ تر ہوجاتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی پہلی ملاقات ۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس کے دوران ہوئی تھی۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے بعد پھر ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں شرکت کی جو ۲۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو منعقد ہوا تھا کہیں صراحت نہیں ملتی کہ علامہ شبلی نے اس میں حصہ لیاہو۔

اس کے بعد علامہ شبلی ۱۹۰۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے چوبیسویں سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔یہ اجلاس ۹تا۱۱/ اپریل ۱۹۰۹ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی (۱۸۵۰-۱۹۲۰ء) نے کی۔بعد ازاں دوسرا اجلاس علامہ شبلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔انجمن حمایت اسلام کے جنرل سکریٹری نے علامہ شبلی کی صدارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

> اس اجلاس کے صدر علامۂ زماں مولانا مولوی شبلی صاحب نعمانی ہیں جن کی نسبت مجھے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی نیابت میزبانی اور بڑا احسان ہے کہ اس جلسے میں تشریف لائے۔گو آپ کے استمزاج کے بغیر آپ کو صدر جلسہ ہونے کی تکلیف دی گئی مگر آپ نے اس کو منظور فرماکر ہمیں عزت بخشی، جس کے لئے ہم ان کے نہایت ہی شکر گذار ہیں۔[۱۰]

اس اجلاس میں سرشیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا (۱۸۷۴-۱۹۵۰)، خلیفہ عمادالدین اسسٹنٹ

---

[۱۰] روداد انجمن حمایت اسلام لاہور، ماہ جولائی ۱۹۰۷ء، ص:۶۳

انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور، حافظ مولوی محمد ابراہیم میر (۱۸۷۴-۱۹۵۶) ایڈیٹر الہادی سیالکوٹ نے اپنے اپنے خطبات وخیالات پیش کئے۔ علامہ شبلی کی صدارتی تقریر کی تفصیل سے انجمن کی روداد خالی ہے اوران کے صدارتی خطبے کا اب تک کہیں سراغ نہیں لگا ہے۔

تیسرے روز یعنی ۱۱/اپریل ۱۹۰۹ء کو دوسرے اجلاس کی صدارت میاں نظام الدین (باغبان پورہ) نے فرمائی۔ اس میں بھی کئی اہل علم نے خطاب کیا۔ آخری خطاب علامہ شبلی کا تھا۔ اس اجلاس کے ناظم مولوی احمد بابا تھے۔ انھوں نے درج ذیل الفاظ میں علامہ شبلی کو خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی:

صاحبان! اب اس وقت شمس العلماء مولانا شبلی، ابن خلدون ثانی، فاضل موزعی و عالم یلمعی، جامع فروغ واصول، اسم بامسمیٰ شبلی نعمانی کا خطاب ہے جن کے دیدار فیض آثار کے لئے ہماری آنکھیں ترستی اور ان کے کلام معجز بیان سننے کے لئے کان اسی طرح منتظر شنیدن ہیں جس طرح گوش روزہ دار بر اذان۔

بعد ازاں علامہ شبلی نے تعلیم وتربیت کے موضوع پر اجلاس سے خطاب کیا اور قرآن، احادیث اور واقعات تاریخ وسیر سے مدلل ومزین بڑی پر اثر اور ولولہ خیز تقریر کی، جس نے مجمع کو بہت متأثر کیا۔ یہاں تک کہ دورانِ خطاب ہی خان بہادر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹- ۱۹۳۲ء) اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

جو سنہری اصول اور قابل قدر بات مولانا صاحب شبلی نے نوجوان مسلمانوں کے لئے فرمائی ہے، میں اس کا صدق دل سے نوجوان مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نوجوانوں میں مذہب کی طرف سے یہ غفلت شرم کے ساتھ تسلیم کرنی پڑتی ہے اور اس کی وجہ موجودہ طرز تعلیم کا خراب اثر ہے، جس کے باعث مذہبی واقفیت کا بالکل موقع نہیں مل سکتا۔ یہ ہمارا قصور نہیں ہے، اگر ہمارا قصور ہوتا تو اس کا بھی میں اقبال کرتا۔ اس زمانے میں اسی قسم کے طرز تعلیم کا رواج ہے، جس پر ہمارے بزرگوں کی مجبوری ہے کہ وہ ہم کو ایسے ہی مدرسے میں بھیجتے ہیں جہاں ہمارے اخلاق پر اس قسم کے اثر پڑتے ہیں۔ جن طلبہ کو کچھ کچھ دینی معلومات حاصل ہیں وہ اپنی خانگی تعلیم کے ذریعہ سے اس سے مستفید ہیں۔ مدرسوں میں تو اس تعلیم کا نام ونشان بھی نہیں ملتا اور اب اس کا قریباً خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معلومات بظاہر ہمارے بزرگوں ہی تک

محدود نظر آتے ہیں۔ اگلی نسل کی نسبت اس قدر واقفیت کی بھی امید نہیں ہوتی۔ میں آپ کو صدق دل سے بتاتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے مذہب کا ہمارے دلوں سے جوش جاتا رہا تو ہماری قوم (خدانخواستہ) تباہ ہو جائے گی۔[۱۱]

اس درمیانی اور ناگہانی گفتگو کے بعد علامہ شبلی نے دوبارہ خطاب شروع کیا اور دیر تک خطاب کرتے رہے۔ تعلیم وتربیت کے موضوع پر یہ علامہ شبلی کا ایک اہم خطبہ ہے، جن لوگوں نے علامہ شبلی کا خطبہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ذخیرۂ معلومات میں یہ خطبہ یقینی طور پر ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

فروغ علم وادب کے خیال سے انجمن حمایت اسلام لاہور نے علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور متعدد اہم کتب شائع کی تھیں۔ اس کی فہرست میں علامہ شبلی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ انجمن حمایت اسلام نے علامہ شبلی کی سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی اور شعرالعجم کی پانچوں جلدوں کو شائع کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انجمن کی فہرست کتب میں سب سے زیادہ علامہ شبلی ہی کی تصنیفات شامل ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی کا انجمن حمایت اسلام لاہور سے کس نوعیت کا گہرا تعلق تھا۔

انجمن ترقی اردو: سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸) نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح وترقی کے لئے محض ایم اے او کالج ہی علی گڑھ میں نہیں قائم کیا تھا بلکہ ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کی بھی بناڈالی تھی، جس کا بنیادی مقصد بھی مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح وترقی کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے جلسے کسی بڑے شہروں میں سال بہ سال منعقد ہوتے اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا جاتا۔ اس کے امکانات پر بحث وتحقیق ہوتی۔ علامہ شبلی پہلے دن سے اس تعلیمی کانفرنس میں شریک تھے بلکہ پہلی قرارداد بھی انہی نے پیش کی تھی، جس کی تائید بانی کانفرنس سرسید احمد خاں نے کی تھی۔[۱۲]

---

(۱۱) روداد انجمن حمایت اسلام، لاہور، ماہ جولائی ۱۹۰۷ء، ص:۱۷

(۱۲) اس کی تفصیلات راقم کی کتاب "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی ۱۹۰۳ء میں اس کا ایک شعبہ انجمن ترقی اردو قائم کیا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ صدر اور شبلی نعمانی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ علامہ شبلی نے بانی سکریٹری کی حیثیت سے باقاعدہ انجمن کے کاموں کا آغاز کیا۔ تمام منتخب عہدہ داروں کی میٹنگ کی اور سب کے مشورے سے اس کا دستور العمل تیار کیا اور اراکین انجمن کے پاس بھیجا گیا۔ پھر ملک کے مختلف علاقوں اور شہروں کے تمام سربر آوردہ اشخاص سے رابطہ قائم کیا اور انہیں انجمن کا رکن بنایا۔ آہستہ آہستہ انجمن کو تمام بڑے بڑے شہروں کے ممتاز اور نمائندہ افراد سے جوڑ دیا گیا۔ اس وقت علامہ شبلی حیدر آباد میں سر رشتہ علوم و فنون حیدر آباد کے ناظم کے عہدے پر فائز تھے، تاہم اس کے بعد بھی انجمن کے لئے وہ مسلسل تگ و دو کرتے رہے۔ اس کی مجالس کا انعقاد کرتے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک انجمن کی آواز اور اس کے مقاصد یعنی ترقی اردو کی صدا بلند کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳-۱۹۵۶ء) نے بھی جو علامہ شبلی کے شاگرد اور اس وقت حیدر آباد میں مقیم تھے، ان کا بھرپور تعاون کیا۔

پھر علامہ شبلی نے اردو زبان کی اصل ترقی کے لئے مختلف علوم و فنون کی ان کتابوں کو اردو میں ترجمے کے لئے منتخب کیا جو اردو زبان میں نہیں تھے یا نہیں کے برابر تھے۔ مترجمین سے رابطہ قائم کیا اور اس کے لئے اشتہارات شائع کرائے۔ ترجمہ کے لئے منتخب کی جانے والی ۱۴ کتابوں کا یکجا ذکر ملتا ہے۔ حالانکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں کی منتخب کتابوں کے تراجم کے لئے علامہ شبلی نے متعدد اشتہارات شائع کرائے۔ مترجمہ کتب کے قابل اشاعت یا نا قابل اشاعت ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے نامور اہل قلم اور مصنّفین کی ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے اراکین میں مولوی نذیر احمد دہلوی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور علامہ اقبال شامل تھے، چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے ہوئے اور اشاعت کے فیصلے کے لئے کمیٹی کے پاس بھیجے گئے۔ البتہ محض دو کتابیں ''تاریخ تمدن'' اور ''رہنمایان ہند'' ہی علامہ شبلی کے عہد نظامت میں شائع ہوسکیں۔ بقیہ تراجم بعد میں شائع ہوئے اور کئی ترجمے نظامت بدل جانے کے سبب شائع نہیں ہوسکے۔ ''نامۂ دانشوراں'' کا ترجمہ علامہ شبلی کے ایک دوست اور اردو و فارسی کے نہایت ممتاز شاعر مولوی ریاض حسن خاں خیال رئیس رسول پور مظفر پور بہار نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۹۱۹ء تک اشاعت کے لئے بابائے اردو مولوی عبد الحق کے پیش نظر رہا۔ اس کے بعد مسودہ ہی غائب ہو گیا۔

ہماری ادبی تاریخ میں انجمن ترقی اردو کا قیام اور ترقی اردو کے لئے اس کی منصوبہ بندی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سنگ میل کے اصل ہیرو ہمارے علمی خانوادے کے مورث اعلیٰ علامہ شبلی نعمانی تھے۔ علامہ نے سربرآوردہ افراد سے انجمن کے لئے مسلسل خط و کتابت کی۔ اس نوع کے متعدد خطوط مکاتیب شبلی میں شامل ہیں۔ انجمن پر بعض ہندو اہل قلم کی جانب سے تعصب اور تنگ نظری کے اعتراضات وارد ہوئے تو اس کا جواب دینے کے لئے علامہ شبلی ہی سامنے آئے اور ایسا مدلل اور مسکت جواب دیا جو معترضین کے درمیان بھی قابل قبول ٹھہرا۔ اس کے جواب میں بعض ہندو ادیب اور اہل قلم نے انجمن کی رکنیت اختیار کی اور ہر طرح کا تعاون کرنے پر آمادہ ہوئے۔

علامہ شبلی نے انجمن کے لئے دو اور اہم کام انجام دیے، جن سے انجمن کو بڑی تقویت ملی اور اس کی قبولیت میں اضافہ ہوا۔ ایک یہ کہ انہوں نے انعامات کا سلسلہ شروع کیا۔ دوسرے یہ کہ انجمن ترقی اردو کی ماہ بہ ماہ رپورٹ لکھ کر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری نواب محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷ء) کو بھیجتے رہے، جسے وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کرتے رہے۔ چونکہ اس میں انجمن ترقی اردو کی تمام کارگذاریوں کا ذکر قدرے تفصیل سے ہوتا تھا اس لئے پورا ملک اس سے دلچسپی لیتا، چنانچہ اس طرح انجمن ترقی اردو باقاعدہ ایک انجمن کی صورت سے متعارف ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب بابائے اردو مولوی عبدالحق سکریٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے انجمن کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے انجمن کی اور انجمن کے ذریعے اردو کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انہوں نے انجمن کی جو بلند و بالا عمارت کھڑی کی اس کے بنیاد گذار دراصل علامہ شبلی ہی تھے۔ بابائے اردو باوجود علامہ شبلی کے شاگرد ہونے کے علامہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، اہل علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ سوائے ابتدائی دور کے ایک موقع کے، جب علامہ نے وفات پائی تھی اور ملک میں ہر طرف ان کا ماتم بپا تھا، انہوں نے کبھی علامہ شبلی کی بنیادی خدمات کا بھی اعتراف نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ

علامہ شبلی کی انجمن سے متعلق خدمات بابائے اردو کی تنگ نظری کے گرد و غبار میں اٹ گئی۔ (۱۳)

انجمن اسلام ممبئی: ہندوستان میں انیسویں صدی میں جو انجمنیں قائم ہوئیں اور جنھوں نے عظیم الشان خدمات انجام دیں بلکہ آج بھی ان کے دم سے خطے کے خطے آباد اور گل و گلزار ہیں ان میں ایک نہایت نمایاں اور ممتاز نام بمبئی کی ”انجمن اسلام“ کا ہے۔ اس کی ایک سو دس سے زیادہ شاخیں تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے لئے اس انجمن کے پاس ایک ہی ادارہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تھا جسے انجمن اسلام کے مخلص لوگوں نے بمبئی اور قرب و جوار کے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور ترقی اور علمی پس ماندگی دور کرنے کے لئے قائم کیا تھا اور جس کو پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (۱۹۰۰-۱۹۶۸) اور عبد الرزاق قریشی (۱۹۱۳-۱۹۷۷) وغیرہ نے خون جگر سے سینچا تھا، وہ سر دست کئی برس سے بند پڑا ہوا ہے اور اس کے مایۂ ناز ترجمان مجلہ ”نوائے ادب“ کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہے۔ ابھی حال تک یہ ادارہ اور مجلہ نوائے ادب اردو کے بلند پایہ رسائل میں شمار ہوتے تھے اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ علم و تحقیق کا ایک اہم مرکز تصور کیا جاتا تھا، ان کا اسلوب و منہج اور طریقۂ کار دارالمصنّفین کا مثیل تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور عبد الرزاق قریشی مرحوم جیسے ادیب و محقق اس کے سربراہ رہ چکے ہیں جو دراصل دبستان شبلی ہی کے پروردہ اور خوشہ چیں تھے۔

علامہ شبلی نعمانی جنوری ۱۹۰۳ء میں جب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ایک سال مسلسل تگ و دو کے بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بمبئی اجلاس میں اپنی مفصل رپورٹ پیش کی۔ ۵۲ صفحات پر مشتمل یہ مفصل رپورٹ بمبئی کی انجمن اسلام ہی کے اجلاس میں پیش کی تھی۔ تین روزہ اجلاس میں علامہ شبلی مسلسل شریک رہے۔ یہ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس سے علاحدہ کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ اور راقم کی نظر سے گذری ہے۔ اور راقم کی کتاب ”علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو“ کے پاکستانی ایڈیشن میں شامل ہے۔

اخیر دور میں حادثۂ پا کے بعد علامہ شبلی بارہا بمبئی جاتے رہے۔ ان کی بعض کتابوں کے کچھ حصے

---

(۱۳) تفصیل کے لئے راقم کی کتاب ”علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو“ مطبوعہ مغربی بنگال، اردو اکادمی، کولکاتا، ۲۰۲۳ء اور انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۲۰۲۴ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بمبئی ہی میں لکھے گئے۔ انجمن کے علاوہ ۲؍ستمبر ۱۹۰۶ء کو بمبئی ہی کی ایک تقریب میں انہوں نے وعظ کہا جو علی العموم بہت پسند کیا گیا۔ اس موقع پر انجمن اسلام کے سکریٹری حاجی یوسف حاجی اسماعیل نے کہا کہ آیندہ مولانا شبلی کا وعظ انجمن اسلام میں کرایا جائے گا، لیکن یہ وعظ غالباً نہیں ہو سکا۔ سید شہاب الدین دسنوی مرحوم (۱۹۱۳-۱۹۹۶) نے اپنی کتاب ''انجمن اسلام کے سو سال'' میں لکھا ہے:

> مولانا شبلی نعمانی، بدرالدین طیب جی اوران کے قائم کردہ انجمن اسلام کے ہمنوا تھے۔ وہ انجمن کے باضابطہ ممبر تو نہیں رہے لیکن جب کبھی بمبئی آتے تو اس کے ماہانہ جلسوں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی تقریر بھی کرتے۔ مولانا کے قلم میں نہ کدورت کی پھانس تھی، نہ زبان پر مصلحت کوشی کا کوئی قفل۔ وہ سیاسی مسائل میں کھل کر بدرالدین طیب جی کا ساتھ دیتے رہے۔[۱۴]

انجمن اسلام مروڈ جنجیرہ: نواب سید سدی احمد آف جنجیرہ (۱۸۶۲ء۔ ۱۹۲۲ء) نے علامہ شبلی کو انجمن اسلام مروڈ جنجیرہ میں لکچر کے لئے مدعو کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی ۱۲؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو قلعہ جنجیرہ گئے اور ۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لکچر دیا۔ یہ لکچر کس موضوع پر تھا، اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انہوں نے انجمن اسلام جنجیرہ کا معائنہ کیا اور کتاب الرائے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے۔ ''آثار شبلی'' مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی تصنیف کے زمانے میں وہ تاثرات راقم کو ملے تو اسے ''آثار شبلی'' میں شامل کیا گیا۔ اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی درج کیا جاتا ہے۔

> مجھ کو یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ ایسے چھوٹے سے دور افتادہ مقام میں جیسا کہ یہ جزیرہ ہے، ایک انجمن قائم ہے، جس نے اپنا مقصد مسلمان بچوں کو تعلیم دلوانا قرار دیا ہے اور اس غرض سے اس نے ایک بورڈنگ ہوس کھولا ہے، جس میں تقریباً ۲۳ بچے مقیم ہو کر اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ہر جگہ اسلامی بورڈنگ کھولے جائیں اور سرکاری مدارس میں تعلیم دلائی جائے۔
>
> انجمن نے اس مقصد کے لئے دو برس کی قلیل مدت میں آٹھ ہزار روپئے جمع کئے جو ایک صریح

---

[۱۴] سید شہاب الدین دسنوی، انجمن اسلام کے سو سال (تاریخ وجائزہ)، انجمن اسلام، بمبئی، اپریل ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷

اور بین کامیابی ہے۔ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو میں نے بورڈنگ ہوس اور طلبہ کو دیکھا۔ چونکہ انجمن نے مجھ سے لکچر دینے کی خواہش کی تھی اور وقت کم تھا اس لئے میں طلبہ کی طریق ماند و بود کو نہ دیکھ سکا۔ وہ صاف ستھرے نظر آتے تھے اور ان کی صورتوں سے زندہ دلی اور ہوشیاری محسوس ہوتی تھی۔

ایک ایسا بورڈنگ جس کے کارکن ایسے مستعد ہوں اور جس کو ہز ہائنس جیسا روشن خیال والیٔ ملک اور ہر ہائنس جیسی تعلیم یافتہ رئیسہ (رفیعہ نازلی بیگم) ہات آئے، ہر قسم کی ترقی کی صحیح امید کر سکتا ہے۔

خاکسار

شبلی نعمانی

۱۴/ اکتوبر ۱۹۰۹ء[۱۵]

انجمن وقف علی الاولاد: ہندوستان کی انگریزی حکومت وقف علی الاولاد کو سرے سے وقف ہی تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی وقف جائدادیں تلف ہو رہی تھیں اور انگریزی جج مسلمانوں کے خلاف فیصلے صادر کر رہے تھے۔ علامہ شبلی کو مسلمانوں کی جائیدادوں کا یہ ضیاع دیکھا نہیں گیا، گو ان سے پہلے بھی بعض ملی دردمندوں نے اس کے لئے کوششیں کی تھیں لیکن علامہ شبلی کا خیال تھا کہ اس مسئلے میں انفرادی طور پر نہیں بلکہ ملت کی اجتماعی کوششوں سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ انہوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں اس کی قرارداد پیش کی۔ اراکین ندوۃ العلماء میں مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری کے علاوہ تمام اراکین نے تائید و حمایت کی۔ اور علامہ شبلی نے تو اس کے لئے اپنی سب صلاحیتیں اور قوتیں لگا دیں اور بالآخر چار برس کی مسلسل جد و جہد اور جاں کاہ محنت کے بعد کامیابی ملی۔

علامہ شبلی نے سب سے پہلے وقف علی الاولاد کو ایک شرعی مسئلہ بتایا اور پھر اسے قرآن و حدیث سے ثابت کیا۔ انہوں نے اس مسئلے پر ایک مدلل رسالہ لکھا، جسے بڑی تعداد میں شائع کرایا اور کم از کم دوبار شائع کرایا اور ملت کے ہر طبقہ اور ہر صاحب علم و فضل اور ملی درد رکھنے والے کے پاس

---

[۱۵] آثار شبلی، محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

بھیج کر اس کی تائید و حمایت حاصل کی۔ پھر ایک فارم تیار کرایا اور یہ منصوبہ بنایا کہ یہ فارم ایک لاکھ سے زاید افراد بھر کر اپنے تائیدی دستخط کے ساتھ انجمن وقف علی الاولاد کے دفتر میں بھیجیں تاکہ حکومت کو یہ باور کرایا جاسکے کہ یہ مسلمانوں کا ایک متفقہ مسئلہ اور طے شدہ موقف ہے۔ اس کے لئے انہوں نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ بھی کیا اور لوگوں کو اس میں سرگرمی سے حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ انہوں نے ملک کے نامور وکلا اور قانون دانوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اپنے موقف کو بہ دلائل سمجھایا۔ حکومت کے ہندو و مسلمان تمام اراکین سے کلکتہ جاکر فرداً فرداً ملے۔ ہندو اراکین پر اپنا قانونی و شرعی موقف واضح کیا، جس کی انہوں نے تائید کی اور حمایت کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام راہیں ہموار ہوگئیں۔ پھر نامور قانون داں مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا کو اس قانون کو بل کی صورت میں منظور کرانے کے لئے آمادہ کیا مگر ان کے اور بعض دوسرے نامور قانون دانوں کے مشورے سے وقف علی الاولاد بل محمد علی جناح نے پارلیامنٹ میں پیش کیا، جسے منظور کرلیا گیا۔ البتہ علامہ شبلی کو محمد علی جناح کے بل سے پورے طور پر اتفاق نہیں تھا، چنانچہ اس میں ترمیم و تصحیح کرانے کے لئے علامہ شبلی بمبئی جاکر ان سے ملے اور اس بل میں شرعی طور پر جو خامیاں تھیں ان پر واضح کیں۔ اس طرح علامہ شبلی اور ان کے لائق احباب، فاضل وکلا اور معروف و ماہر قانون داں اور تلامذہ شبلی کی چار سال کی مسلسل جدوجہد سے یہ قانون پاس ہوا اور مسلمانوں کی قیمتی جائیدادیں تلف ہونے اور ناجائز قبضے سے محفوظ ہوگئیں۔

آج ایک صدی بعد ہمارے سامنے پھر وہی مسئلہ آن پڑا ہے۔ یعنی اوقاف اسلامی پر غاصبانہ قبضے کے لئے باقاعدہ قانون کے تحت تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بل پارلیمنٹ سے پاس ہو چکا ہے اور اسے قانونی شکل بھی دی جاچکی ہے۔ یہ عہد شبلی سے بڑا معاملہ ہے۔ اس وقت انگریز جیسے ملک دشمنوں اور غاصب قابضوں سے ہمارا واسطہ تھا اور آج برادران وطن جن کے ساتھ مل کر ہمارے آباء واجداد نے آزادی کی جنگیں لڑی تھیں اور اپنا خون بہایا تھا، اب وہی دشمن اور مخالف بن کر ہمارے مدمقابل ہیں اور روز بہ روز نت نئے مسائل اور دھمکیوں سے ملت کو خائف کر رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ آج ملت میں علامہ شبلی جیسا جری، فدائی اور حمیت اسلامی کے جذبات سے سرشار ہو کر سر کی بازی لگانے والا اور تمام راحت و آرام تج دینے والا کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا ہے اور مولوی مظہر الحق (۱۸۶۶-۱۹۳۰) بیرسٹر ایٹ لا اور سر علی امام (۱۸۶۹-۱۹۳۲ء) جیسا مدبر بھی

ہمارے پاس نہیں۔

انجمن وقف علی الاولاد کے لئے جب علامہ شبلی ملک میں جدوجہد کر رہے تھے تو انہیں جابجا اسلامی اوقاف کی ناگفتہ بہ صورت حال سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ وقف علی الاولاد کی کامیابی نے ان میں اوقاف اسلامی کی جدوجہد اور تگ ودو کا جذبہ بیدار کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴- ۱۹۵۳) لکھتے ہیں:

> مولانا سے پہلے بھی قوم کے کارکن اور ذی احساس افراد نے ادھر توجہ کی تھی اور ان کے مداخل ومصارف کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی کی طرف متوجہ ہو لیکن گورنمنٹ نے یہ جواب دیا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں: ایک تو یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے اور دوسرے یہ کہ ان اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں نہیں صرف کی جاتی۔ اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی اور ایسا ضروری معاملہ جوں کا توں رہ گیا۔[۱۶]

مولانا (شبلی) نے وقف اولاد کے بعد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی اور جنوری ۱۹۱۴ء میں ایک عام خط شائع کیا۔[۱۷] اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر علامہ شبلی کا یہ طویل خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> آپ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور تمدنی ضروریات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، جس کے لیے مصارف کثیر درکار ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہر روز ایک نیا چندہ کھولنا پڑتا ہے، لیکن اس غریب قوم کی یہ حالت نہیں کہ ان تمام چندوں کی متحمل ہو سکے، اس لیے اکثر کام ناتمام رہ جاتے ہیں اور قومی ضرورتوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔
>
> اس کی سب سے بہتر اور آسان تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کروروں روپئے کے جو اسلامی اوقاف ہیں ان کا ایسا معقول انتظام ہوتا کہ وہ بیجا مصارف میں نہ صرف ہوتے اور صحیح ضروریات کے کام میں آتے۔ اسی ضرورت سے مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بار بار یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی پر متوجہ ہو لیکن گورنمنٹ سے یہ جواب ملا کہ دو باتیں

---

[۱۶] مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص:۵۲۲

[۱۷] حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص:۵۲۲

ثابت کرنی چاہئیں، ایک یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اوقاف صحیح مصرف میں نہیں صرف کئے جارہے ہیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہہ دینا نہایت آسان ہے کہ اوقاف کا انتظام کیا جائے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کون کرے اور کس طرح کیا جائے۔ گورنمنٹ تو اس لیے دست اندازی نہیں کرسکتی کہ وقف عموماً ایک مذہبی چیز ہے اور گورنمنٹ کسی مذہبی چیز میں ہاتھ ڈالنے سے ہمیشہ محترز رہتی ہے اور اس کو محترز رہنا چاہئے۔ قوم میں کوئی شخص یا چند اشخاص متوجہ ہوں تو وہ کیا کرسکتے ہیں۔ متولیان اوقاف پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ عدالت میں اگر مقدمات دائر کئے جائیں تو اس طول عمل اور دردسری اور سب سے بڑھ کر مصارف کا کون متکفل ہوسکتا ہے۔

اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ ایک مختصر سی کمیٹی قایم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے اور کوئی صحیح اور متعین اور قابل عمل طریقہ تجویز کرکے ایک اسکیم (خاکہ) بنائے جو قوم کے سامنے پیش کیا جائے اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے۔ اس بنا پر میں آپ سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ اس کی ممبری قبول فرمائیں۔

چند سرسری باتیں میں بہ دفعات ذیل پیش کرتا ہوں:

۱۔ ایک موریل[۱۸] تیار کیا جائے جس میں انتظام اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے اور اس موریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ موریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے۔

۲۔ گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقے کی ہو کہ مذہبی دست اندازی کا کسی طرح احتمال پیدا نہ ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قایم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقے پر انتخاب کیے جائیں اور انتخاب کی تمام کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے۔ پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے دیے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شایع کی جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

---

[۱۸] یعنی میمورینڈم

۳۔ تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کا ایک خاص عہدہ تھا، جس کو صدر الصدور کہتے تھے، کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قایم کیا جائے۔ لیکن صدر الصدور کا تقرر اسی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔ ان کے علاوہ اور جو تجویزیں آپ کے خیال میں آئیں آپ تجویز فرمائیں۔[۱۹]

یہ مفصل مراسلہ علامہ شبلی نے اخبارات کو جس عزم وہمت اور حوصلے سے لکھا تھا اصلاً اس کا وقت جاچکا تھا، عمر ڈھل چکی تھی ۔ امراض نے آگھیرا تھا مگر علامہ حمیت اسلامی سے معمور اور مزاج سے مجبور تھے، چنانچہ کام شروع کردیا۔ اس کے بعد وہ کل آٹھ ماہ اور زندہ رہے۔ اس ۸ ماہ میں بھی ''سیرۃ النبی'' کی تکمیل کے لئے جدوجہد کررہے تھے۔ دارالمصنّفین کی بناو تاسیس کا طویل علمی وتحقیقی منصوبہ بھی زیر تکمیل تھا۔ طلبہ کو درجۂ تکمیل کے لئے اعظم گڑھ بلاچکے تھے۔ تصنیف وتالیف کے مشن میں مردم سازی پر بھی وہ کام کررہے تھے۔ دوسری طرف اپنے مخالفین اور ندوے کے کم ظرف مولویوں سے بھی نبرد آزما تھے۔ ان کے خطوط ومراسلات کے اخباروں میں جوابات بھی لکھ رہے تھے۔ خدا جانے وہ کس فولاد کے بنے تھے۔ حق مغفرت کرے ملت کا عجیب ہمدرد شخص تھا۔ افسوس اوقاف اسلامی کے کاموں کا آغاز تو کیا مگر انجام کار سے پہلے ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

انجمن خدام کعبہ: علامہ شبلی نعمانی کو چونکہ عالم اسلام اور خاص طور سے خلافت اور ترکوں سے بے پناہ محبت تھی، اس لئے ان کے معاملات ومسائل پر ہمیشہ ان کی نگاہ رہا کرتی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی پر حملہ کیا تو ہندوستانی مسلمان بے چین ہو اٹھے اور ترکوں کی حمایت میں جابجا جلسے اور چندے ہوئے اور ان کی امداد کی گئی۔ علامہ شبلی اعظم گڑھ کے جلسے میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ترکوں کے لئے چندہ کرکے اس زمانہ میں تین ہزار کی خطیر رقم جمع کی اور ترک سفیر حسین حسیب آفندی (۱۸۳۸ء-۱۹۱۲ء) مقیم بمبئی جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک ہندوستان میں سفیر کے عہدے پر فائز رہے، کے ذریعے وہ رقم قسطنطنیہ بھیجی۔

---

[۱۹] تاریخ ۲۶ جنوری ۱۹۱۴ء مقالات شبلی، جلد ہشتم، ص: ۳۴-۳۵

اسلام اور شعائر اسلام بالخصوص حرمین شریفین پر خطرے کا جب جب انہیں احساس ہوا، اپنے دائرے سے باہر آکر اپنی تحریروں اور اشعار میں ان کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا۔ ان کی مشہور نظم ''شہر آشوب اسلام'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئیں
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک[20]

اس نوع کے اور بھی خیالات اور اشعار ومنظومات ان کے کلیات میں موجود ہیں جن میں حرم شریف اور دیگر شعائر اسلامی کا ذکر ہے۔ علامہ شبلی کا یہ احساس اور فکر وتشویش اس دور میں عام بات ہوتی جا رہی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے بعض ممالک خلافت عثمانیہ پر پے در پے حملے اور اس کے حصے بخرے کر رہے تھے اور اس کے کئی حصوں پر قابض ہو چکے تھے:

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک[21]

ان مسائل سے مسلمانوں کے احساس واضطراب میں نہ صرف اضافہ ہو رہا تھا بلکہ یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں صید افگنوں اور اسلام دشمنوں کے ہاتھ دامان حرم تک نہ پہنچ جائیں۔ پھر اسی زمانے میں سر پھرے اطالوی بادشاہ وکٹر عمانویل سوم (۱۹۰۰-۱۹۴۶ء) کا یہ بیان بھی آگیا کہ ''ہمارے جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نمٹ سکتے ہیں''۔[22]

اس نازیبا بیان اور ان کی سرگرمیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات میں اشتعال پیدا

---

[20] کلیات شبلی، اردو، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۸ء، ص: ۱۲۱

[21] کلیات شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۷

[22] علی برادران، رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء، ص: ۹۵

کر دیا اور یہ رائے قائم ہوگئی کہ اب حرمین شریفین کی حرمت اور اس کی عزت و ناموس کے بقاو تحفظ کے لئے ترکی حکومت پر اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے حرمین کی حفاظت کی خود سے تدابیر کرنی چاہیں۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۸۷۸-۱۹۲۶) کی اس سلسلہ کی کوششیں بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کوششوں کا بقول ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، یہ اثر ہوا کہ:

> عالم اسلام کے اس وقت کے سیاسی حالات اور برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے جذبات اسلامی سے اس دور کا ادب بہت متاثر ہوا اور نہ صرف سنجیدہ سیاسی مضامین کے ذریعے بلکہ افسانوں، ڈراموں اور منظومات کے ذریعے بھی ان اسلامی جذبات واحساسات کا اظہار ہوا۔ ہر مسلمان شاعر و ادیب نے ان جذبات کے فروغ واشاعت میں حصہ لیا، خصوصاً حضرت علامہ شبلی اور مولانا ظفر علی خاں نے ایسی ملک گیر شہرت پائی کہ ان کا کلام بے نظیر جو ترکوں کی حمایت میں تھا، ہر پڑھے لکھے اور اخبار بیں کی زبان پر چڑھ گیا۔[۲۳]

جذبات کے اس بحر بے کراں کو یکجا اور اسے مفید و مؤثر بنا کر حرم شریف کی حفاظت کے لئے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو ایک نئی تنظیم کی ضرورت کا احساس ہوا، چنانچہ انہوں نے علی برادران سے مل کر گفت و شنید کے بعد انجمن خدام کعبہ کی تشکیل کا منصوبہ بنایا۔ پہلے دستور سازی کے لئے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا، جس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں، پھر کچھ مدت بعد ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو "انجمن خدام کعبہ" کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں قائم کیا گیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی خادم الخدام (صدر) اور مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء- ۱۹۳۰ء) اس کے معتمد عمومی (معتمد خادم الخدام) منتخب ہوئے اور اسی دن حرم کے ان دیوانوں نے اپنے عہدوں کا حلف بھی لے لیا اور باقاعدہ انجمن کے کاموں کا آغاز ہوا۔

اسی تاریخ کو "انجمن خدام کعبہ" کا دستور العمل منظور کیا گیا اور اراکین انجمن کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ مستقل اور وقتی "شیدائیان کعبہ" کی علاحدہ علاحدہ جماعتیں منتخب ہوئیں اور اس کا بنیادی مقصد حرم محترم کے تقدس کا تحفظ اور اس کو پامالی سے بہر صورت محفوظ رکھنا قرار پایا۔ مولانا

---

[۲۳] انجمن خدام کعبہ، ص:۱۰-۱۱

محمد علی جوہر نے انجمن خدام کعبہ کے دستور کو اپنے ہفت روزہ اخبار ''ہمدرد'' دہلی میں شائع کیا اور اس کی تمہید میں لکھا کہ:

اس مبارک تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جناب مولوی عبد الباری صاحب فرنگی محلی کے مکان پر ۶؍ مئی کو ایک جلسہ منعقد ہوا تھا اور شرکائے جلسہ نے بحث و مباحثہ کے بعد قواعد وضوابط مندرجہ کو منظور کیا اور جلسہ ختم ہوتے ہی چند حضرات نے خدام کعبہ کا حلف لیا۔[۲۴]

دستور کے مطابق تقریباً دو برس تک انجمن خدام کعبہ سرگرم عمل رہی۔ اراکین انجمن اور شیدائیان کعبہ بڑی مستعدی سے کام کرتے رہے۔ علمی اور عمومی بیداری کے لئے انجمن کا ماہانہ رسالہ ''خدام الکعبہ'' جاری کیا گیا اور مولانا شوکت علی (۱۸۷۳-۱۹۳۸ء) اس کے مدیر مقرر ہوئے۔

ملک کے مختلف شہروں میں ممبر سازی ہوئی۔ لوگوں نے بڑی دلچسپی لی اور ایک قابل ذکر تعداد نے انجمن خدام الکعبہ کی رکنیت قبول کی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء تک انجمن خدام کعبہ کے اراکین کی تعداد اور دیگر معاملات کی تفصیل مولانا شوکت علی نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

خدمت کعبہ کا شوق مسلمانوں میں جس سرگرمی سے بڑھتا جاتا ہے اور جس خلوص وعقیدت سے وہ انجمن کی صدا پر لبیک کہتے ہیں اور باوجود مخالفین کی تخویف وترہیب کے شریک ہوتے ہیں اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ خدام کعبہ کی تعداد ۱۳۳۱ھ کے اواخر میں تین ہزار چار سو اکتیس تھی لیکن اب ۱۳۳۲ھ کے خاتمہ پر خدام کی تعداد سترہ ہزار ایک سو چھتر ہے اور ابھی جمعیت دہلی وامرتسر وغیرہ کے ممبران کی جدید تعداد موصول ہو کر درج نہیں ہوئی ہے۔ ان کی تعداد آجانے پر یقین ہے کہ بیس ہزار کے قریب تمام تعداد ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے یہ آثار محسوسات پتا دیتے ہیں کہ:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے[۲۵]

مگر پھر انجمن کچھ مالی دشواریوں، افراد کی کمی اور سب سے بڑھ کر حکومت کی سازش کے سبب

---

[۲۴] علی برادران، ص: ۸۷

[۲۵] ماہنامہ خدام الکعبہ، دہلی، محرم الحرام ۱۳۳۳ھ، ص:۳۹، مدیر مولانا شوکت علی

ناکام ہو کر ختم ہو گئی۔ اسی زمانے میں علی برادران گرفتار کر لئے گئے۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیان کے مطابق حکومت نے انجمن خدام کعبہ کو ختم کرنے ہی کے لئے انہیں گرفتار کیا تھا۔ شیدائیان کعبہ کے ساتھ انگریزی حکومت نے کیا رویہ اختیار کیا، اس کی ایک جھلک ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری (۱۹۴۰ء-۲۰۲۱ء) کے اس جائزے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

انجمن کے خدام اور شیدائیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔ بیشتر کارکن اپنی ہی جماعت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دفتر کے کاغذات، خطوط، ارکان کے نام، پتوں اور کوائف کے رجسٹر اٹھا کر پولیس کے حوالے کر دیے۔ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی اور دفتر پر قبضہ کر لیا اور ارباب انجمن کو اس سے بے تعلق کر دیا گیا۔[۲۶]

اس طرح ایک مختصر سی مدت میں انجمن حکومت کی سازش اور تادیبی کارروائیوں سے اپنا وجود کھو بیٹھی، لیکن مختصر مدت میں بھی انجمن نے کئی اہم کام انجام دیے اور کئی ماہ دسمبر ۱۹۱۴ء تک اور کاموں کے ساتھ دہلی سے ماہنامہ خدام الکعبہ بھی جاری رکھا۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں وفات پائی تو انجمن خدام کعبہ کے ترجمان ماہنامہ "خدام الکعبہ" میں مولانا شوکت علی نے ان کا ماتم کیا۔ اس سے نہ صرف استاد کی وفات پر ایک شاگرد کے احساسات سامنے آتے ہیں بلکہ انجمن خدام کعبہ سے علامہ شبلی کے تعلق اور اس کی نوعیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

امام الہند شبلی طاب ثراہ

۱۳۳۲ھ

انجمن خدام کعبہ کی جمعیت اصلیہ کے زبردست رکن شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی ذات انجمن (خدام کعبہ) کے نظام عمل میں ایک بہترین معاون و مشیر کی تھی اور ابتدا میں ترتیب دستور العمل کے وقت ان کی اصابت رائے نے بڑے بڑے دقتوں اور مشکلات کو آسان کیا۔

---

[۲۶] انجمن خدام کعبہ، ص: ۴۳

مسلمانوں کی قوم جس کا گھر کبھی علم و تصانیف کے خزانوں سے بھرا پڑا تھا، اس زمانہ میں اذاالصحف نشرت میں اگر کسی پر فخر کرتی تھی تو وہ علامہ شبلی کا وجود تھا۔ ان کے قلم و زبان کی بدولت وہ فراموش خواب یاد آجاتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے علوم و تاریخ کو مغرب کے پسندیدہ طرز اور درایت کے سانچے میں ڈھال کر اسلامی خدمت کی اور مؤثر اور دلچسپ طریقے سے سمجھایا کہ:

تو راز کنگرهٔ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ در ایں دامگہ چہ افتاد ست(۲۷)

فارسی شاعری سے انہوں نے ثبوت دیا کہ سرزمین کیانی سے بغیر دنیوی تعلق کے بھی ہندوستان کے ذرے، صاحب "شعر العجم" کا سا مصنف و شاعر پیدا کر سکتے ہیں اور اردو شاعری سے انہوں نے بتلادیا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو یوں ابھارا جا سکتا ہے اور سلف صالحین کا نمونہ بننے کے لئے اس طرح ترغیب دی جاتی ہے اور اس "جزو پیغمبری" سے یوں کفر آئین مسلموں کو ہدایت ہوتی ہے۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں وہ بے مثال پیکر دامن خاک میں چھپ گیا جس میں علم کی حقیقی روح تھی اور جو اپنے صحیح معنوں میں شمس العلماء تھا۔

اپنی بزم آرائیوں کا دعویٰ کس منہ سے کریں
شمع تھی وہ بجھ گئی جو گل تھے وہ مرجھا گئے(۲۸)

علامہ شبلی نے انجمن خدام کعبہ کی تنظیم و ترتیب اور دستور العمل تیار کرنے کے علاوہ اس کی اور کیا کیا خدمات انجام دیں، اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی۔ البتہ انجمن خدام کعبہ کی حمایت میں انہوں نے ایک بڑی مؤثر نظم "خدمت کعبہ" لکھی ہے جو مولانا محمد علی جوہر نے اپنے ہفت روزہ اخبار "ہمدرد" دہلی میں ۳؍مارچ ۱۹۱۴ء کے شمارے کے سرورق پر علامہ شبلی کے فرضی نام "کشاف" سے شائع کی ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت سے واضح ہے کہ یہ تحریک خدام کعبہ کے بالکل ابتدائی دنوں میں کہی گئی ہے۔ وہ نظم درج ذیل ہے:

---

(۲۷) ماہنامہ خدام الکعبہ، دسمبر ۱۹۱۴ء، ص:۲۹

(۲۸) ماہنامہ، خدام الکعبہ، دہلی، محرم الحرام، ۱۳۳۳ھ، ص ۳۹-۴۰

خدمت کعبہ

خادمِ کعبہ وہ ہے، جس کو ہے پیارا اللہ
عزت کعبہ ہے، اللہ کی عزت گویا
ماہِ ذی الحجہ میں دیکھے کوئی خلقت کا ہجوم
شوکت کعبہ ہے، اسلام کی شوکت گویا
جانب کعبہ اگر اٹھ گئی بدبیں کی نظر
تو یہ سمجھو کہ ہے دنیا میں قیامت گویا
خدمت کعبہ میں دیتے ہیں گرہ سے جو کچھ
دامن کعبہ میں ہم بھرتے ہیں دولت گویا
جس کو خدمت سے گریز اس کو ہے کعبہ سے گریز
اور گریز اس کو ہے اسلام سے نفرت گویا
دل سے جو شخص نہ ہو جانبِ کعبہ مائل
اس کے دل میں نہیں ایمان کی وقعت گویا
خدمت کعبہ رسولِ عربیؐ نے کی ہے
اس کی خدمت تو ہے تقلید رسالت گویا[۲۹]

یہ علامہ شبلی کی ایک نادر نظم ہے اور نادر زمین ور دیف میں بھی۔ یہ ''کلیات شبلی'' میں شامل بھی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انجمن خدام کعبہ کے متعلق یہ نئی معلومات حیات شبلی میں ایک قیمتی ورق کے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

•••

---

(۲۹) ہمدرد، دہلی، ۳ر مارچ ۱۹۱۴ء، ص:۱، بحوالہ انجمن خدام کعبہ، ص:۹۲

اخبار علمیہ

کائنات عظیم ترین کمپیوٹر ہے؟

برطانیہ کی پورٹس ماؤتھ یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر میلوِن واپسَن Melvin Vopson نے اپنی تازہ ترین تحقیق میں دکھایا ہے کہ کائنات کی قوت جاذبیت (gravity) صرف کائنات کے مختلف مکونات کو کھینچتی ہی نہیں ہے بلکہ کائنات اس طاقت کو اپنے آپ کو منظم رکھنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ پہلے بھی متعدد سائنسداں یہ رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ پورا نظام کائنات معلومات پر مبنی ہے اور وہ ایک کمپیوٹر جیسا ہے۔ یہ رائے سائنس کی ایک برانچ انفارمیشن فزکس سے نکلی ہے جو کہتی ہے کہ کائنات کی مادی حقیقت ایک منظم معلوماتی نظام پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر واپسن نے اپنی تحقیقات میں دکھایا ہے کہ قوت جاذبیت کائنات کے اندر پائے جانے والے کمپیوٹر کے عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قوت جاذبیت اس عمل کا نتیجہ ہے جس کے ذریعے کائنات مادے کے بارے میں معلومات کو منظم کرتی ہے۔ انفارمیشن ڈائنامکس کے دوئم قانون کو استعمال ہوئے انھوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ کائنات میں مواد اور اَجرام ایک دوسرے سے کشش کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں کیونکہ کائنات کوشش کرتی ہے کہ اس کی معلومات منظم اور یکجا compressed رہیں۔ ڈاکٹر واپسن نے کہا کہ میری تحقیقات بتاتی ہے کہ کائنات ایک عظیم ترین کمپیوٹر کے طور پر کام کرتی ہے۔ جس طرح کمپیوٹر اپنے اندر جگہ (اسپیس) کی حفاظت کرتے ہیں اور معلومات کو منظم رکھتے ہیں تاکہ وہ زیادہ بہتر طور سے اپنے کام کو انجام دے سکیں، اسی طرح کائنات بھی اپنے کام انجام دیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کائنات کے بارے میں سوچنے کا نیا زاویہ ہے جس کے مطابق جاذبیت اس عمل کی پیداوار ہے جس کے ذریعے کائنات خود کو منظم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو اس کا اثر اور بہت سے نظریات پر پڑے گا جیسے بلیک ہول، ڈارک میٹر، ڈارک انرجی وغیرہ۔

(SCI.News–۲۸، اپریل ۲۰۲۵۔ ڈاکٹر واپسن کا پیپر Pubs.AIP.org جرنل میں چھپا ہے)

(ظ۔ا۔خ)

لیو XIV ویٹیکن کی تاریخ میں پہلے امریکی پوپ منتخب

امریکی کارڈینل رابرٹ فرانسس پریوسٹ نے نئے پوپ کے طور پر عہدہ سنبھال لیا ہے۔ اس طرح وہ کیتھولک چرچ کے ۲۶۷ویں پوپ بن گئے اور لیو XIV اپنا نام اختیار کیا ہے۔ نئے پوپ نے جمعرات، ۸ مئی ۲۰۲۵ کو ویٹیکن میں سینٹ پیٹرز باسیلیکا کی بالکونی سے اپنی پہلی عوامی نمائش کی۔ بہ حیثیت ان کی زبان سے جو پہلے الفاظ نکلے وہ یہ تھے "تم پر سلامتی ہو"۔ انہوں نے بات چیت کے ذریعہ پل بنانے پر زور دیا۔ یہ مرحوم پوپ فرانسس کے قریبی معاون اور ایک اعتدال پسند شخصیت ہیں جو مختلف مکاتب فکر کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی مسائل اور حالات کا انہیں بھرپور تجربہ ہے۔ شکاگو سے تعلق رکھنے والے ۶۹ سالہ نئے پوپ چرچ کی تاریخ میں اس عہدے پر فائز ہونے والے پہلے امریکی ہیں۔ امریکی سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے ایک امریکی کو منتخب کرنے کے بارے میں روایتی خدشات کے باوجود، پیرو میں ان کی طویل مشنری خدمات نے ان تحفظات کو دور کرنے میں مدد کی۔ پریوسٹ نے پیرو کے ٹرجیلو میں مشنری کام میں ایک دہائی سے زیادہ وقت گزارا ہے۔ انہیں بشپ آف چیکلیو مقرر کیا جاچکا ہے جہاں انہوں نے ۲۰۲۳ء تک خدمات انجام دیں۔ انہوں نے آگسٹی نیئن آرڈر کے سپیریئر جنرل کے طور پر بھی خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں عالمی قیادت کا تجربہ بھی ہے۔ انھوں نے لاطینی امریکہ کے پونٹیفیکل کمیشن کے صدر کے طور پر بھی کام کیا ہے۔ پریوسٹ کو ایک پرسکون اور نپے تلے رہنما کے طور پر بھی جانا جاتا ہے، جو آمرانہ انداز کا سہارا لیے بغیر ترقی حاصل کرنے کے قائل ہیں۔ وہ واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں لیکن کسی پر اسے زبردستی مسلط نہیں کرنا چاہتے۔ ویٹیکن کے تجزیہ کار ایلیس ایلن نے کہا کہ ویٹیکن انہیں ایک ایسے رہنما کے طور پر دیکھتا ہے جو تنازعات کے بغیر تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پریوسٹ نے ولانووا یونیورسٹی سے ریاضی میں بی اے کیا۔ پھر کینن لاء میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے روم بھیجے جانے سے پہلے شکاگو میں الٰہیات کی تعلیم حاصل کی۔ انہیں ۱۹۸۲ میں ایک پادری مقرر کیا گیا تھا۔ وہ چرچ کے اداروں میں خواتین کی شمولیت کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف اور ان کی حقیقی اور موثر شرکت کی تصدیق کرتے ہیں۔ انہوں نے چرچ کے اندر ہونے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے کام جاری رکھنے کی ضرورت پر یہ کہتے ہوئے زور دیا کہ "سڑک ابھی لمبی ہے۔" (صحیفۃ الوطن، بحرین، ۹ مئی ۲۰۲۵ء)

(ک، ص اصلاحی)

عابد رضا بیدار
ایک صاحبِ علم و بصیرت شخصیت کا علمی و ادبی مرقع

ڈاکٹر عطا خورشید
atakhursheed2012@gmail.com

خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائریکٹر، معروف محقق، شاعر، ماہرِ لائبریری سائنس اور ایک صاحبِ طرز ادیب، ڈاکٹر عابد رضا بیدار ۲۸/مارچ ۲۰۲۵ء، مطابق ۲۷/رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ، بروز جمعہ (یومِ الوداع) اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

ڈاکٹر عابد رضا خان بیدار ۴/فروری ۱۹۳۲ء کو رامپور کے علمی و تہذیبی ماحول میں پیدا ہوئے۔ والد محترم حامد رضا خاں کی گود میں آنکھ کھولنے والے بیدار صاحب اپنے تین بھائیوں اور پانچ بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر رامپور ہی میں حاصل کی، لیکن اعلیٰ تعلیم کی جستجو انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کھینچ لائی، جہاں سے انھوں نے اسلامیات میں ایم اے کیا اور بعد ازاں پروفیسر سید مقبول احمد کی نگرانی میں ۱۹۵۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کا شعبہ یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر بشیر الدین کی نگرانی میں قائم ہوا۔ بیدار صاحب اس کے پہلے بیچ کے طالب علم بنے۔ ان کے علمی تجسس اور ادارہ جاتی اصلاحات میں دلچسپی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں مولانا ابو الکلام آزاد کے انتقال پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد تعزیتی جلسے میں بیدار صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زیرِ تعمیر مرکزی لائبریری کا نام "مولانا آزاد لائبریری" رکھنے کی تجویز پیش کی، جو متفقہ طور پر منظور کی گئی۔ آج یہی عظیم کتب خانہ "مولانا آزاد لائبریری" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اپنے عملی سفر کا آغاز بیدار صاحب نے رامپور رضا لائبریری میں بطور کیٹلاگر کیا۔ رامپور کی ہی

صولت پبلک لائبریری سے بھی ان کا تعلق رہا اور اس لائبریری میں موجود فارسی و عربی مخطوطات کی جو فہرست سازی انھوں نے کی، وہ ۱۹۶۶ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں دہلی میں "رامپور انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز" کے تحت ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، جہاں سے کئی علمی و ادبی کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ ایک باکمال شاعر بھی تھے اور "بیدار" تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۶۹ء میں ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔ شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء کے آس پاس کیا لیکن پٹنہ منتقل ہونے کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

سنہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی کے شعبۂ ویسٹ ایشین اینڈ نارتھ افریکن اسٹڈیز میں لکچرر رہے۔ ۱۹۷۲ء میں وہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے پہلے مستقل ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس سے قبل یہ عہدہ اعزازی ہوا کرتا تھا۔ ان کی تقرری کے بعد مخالفتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا کیونکہ مقامی افراد اس عہدے پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے، لیکن بیدار صاحب نے ہمت نہ ہاری بلکہ اسی دوران پٹنہ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے عدالت میں اپنا دفاع خود کیا۔

اُن کی شخصیت میں ایک سیمابی کیفیت تھی۔ وقت کے پابند اور عملیت پسند تھے۔ وہ نہایت ہی پھرتیلے تھے اور اپنی ہی طرح لائبریری کے تمام اسٹاف کو پھرتیلا دیکھنا چاہتے تھے۔ لائبریری کے مختلف شعبوں میں سرپرائز وِزِٹ کیا کرتے تھے۔ اگر اسٹاف میں سے کسی کو بیکار بیٹھا دیکھتے تھے تو فوری اس کی پرسش ہو جایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں کا عملہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتا تھا۔

سنہ ۱۹۷۲ء میں جب انھوں نے خدابخش لائبریری کا چارج لیا تو اُس لائبریری کی حالت نہایت ہی دگرگوں تھی۔ کتابوں کا کوئی سائنٹفک کیٹلاگ نہیں تھا۔ ہزاروں کتابوں کا کیٹلاگ تیار کرنا اُس وقت کے پرانے عملے کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا اُنھوں نے مقامی کالج اور یونیورسٹی کے ضرورت مند طلبا سے رابطہ کر اُن لوگوں سے اُجرت پر کارڈ کیٹلاگ تیار کرائے۔ وہ طلباء آج اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔

باصلاحیت نوجوانوں کو ہمیشہ آگے بڑھاتے تھے بالخصوص اپنی لائبریری میں منعقدہ سمینارز میں نوجوانوں کو بولنے کے لیے ابھارتے تھے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ صلاحیتیں دیکھ کر وہ اُنھیں اپنی لائبریری میں ملازمت بھی دیا کرتے تھے۔ نہ صرف نوجوانوں کو بلکہ اپنی ملازمت

سے سبکدوش فارسی و عربی کے اساتذہ کو بھی لائبریری میں کام کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ ان لوگوں میں پروفیسر عطا کاکوی، سید شاہ محمد اسمٰعیل، حکیم محمد یوسف صاحبان سرفہرست ہیں۔

لائبریری کیمپس میں ایک نئی عمارت جس کے نچلے حصے میں دس کمروں پر مشتمل ایک گیسٹ ہاؤس اور اوپری منزل پر ایک وسیع و عریض سمینار ہال کی تعمیر کی۔ ریسرچ اسکالرز کے لیے سہولیات فراہم کرنا اور اُن کے ذریعہ علمی لیکچرز کا اہتمام ان کا خاص شوق تھا۔ اُن کے دَور میں بیرونی اسکالرز کے ہفتے میں دو تین لیکچرز ہونا معمول کی بات تھی۔

لائبریری کیمپس کے ایک حصے میں ان کی رہائش تھی جس کے ڈرائنگ روم کو انھوں نے اپنا آفس بنا رکھا تھا۔ جو لوگ بھی گیسٹ ہاؤس میں قیام کر چکے ہیں وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ جب اُن کی آنکھ کھلتی تو وہ بیدار صاحب کو اپنے آفس میں کام کرتے ہوئے پاتے اور جب وہ شب میں سونے کے لیے تیار ہوتے تو اُس وقت بھی وہ بیدار صاحب کو اپنی آفس میں کام کرتے ہوئے پاتے۔

بیدار صاحب نے نہ صرف سیمینارز کے انعقاد کی روایت قائم کی بلکہ بین الاقوامی سطح کے "ساؤتھ ایشین ریجنل سمینار" کا آغاز بھی کیا۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۹ء تک ہر سال مختلف موضوع مثلاً تصوف، طب، تفسیر، تاریخ ہند اور ہندی الاصل مذاہب جیسے موضوعات پر بین الاقوامی سیمینارز منعقد کیے، جن کی رودادیں خدا بخش لائبریری سے شائع ہوئیں۔ ان سمینارز کے سیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد، دہلی میں بھی منعقد کرائے گئے۔

صحافت سے ان کی دل چسپی بھی بہت پرانی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ سے "علیگ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار، ۱۹۵۷ء میں "مشرق وسطیٰ" اور ۱۹۶۳ء میں رامپور سے "نیا خواب" جاری کیا۔ ۱۹۷۷ء میں خدا بخش لائبریری سے "خدا بخش لائبریری جرنل" کے نام سے ایک کثیر لسانی (اردو، فارسی، انگریزی اور عربی) مجلے کا اجرا کیا جس کی اشاعت آج بھی جاری ہے۔

عابد رضا بیدار کو قدیم اردو رسائل و جرائد سے نہ صرف گہری دلچسپی تھی بلکہ ان کی ترتیب و تدوین اور فہرست سازی کا شوق بھی علمی سنجیدگی سے بھرپور تھا۔ انھوں نے علمی رسائل کو محفوظ رکھنے، ان کے مواد کی درجہ بندی کرنے اور انھیں تحقیق کے قابل بنانے کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دیں، وہ آج بھی محققین کے لیے نہایت مفید اور رہنما ثابت ہو رہی ہیں۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں، سن پچاس کی دہائی میں ہی، انھوں نے علی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی تاریخ پر ایک سلسلہ ''ہماری زبان'' (انجمن ترقی اردو، دہلی) میں شروع کیا، جو اپنی تحقیقی افادیت اور علمی معیار کی بناپر اردو قارئین میں بہت جلد مقبول ہوگیا۔ اسی شغف کے تحت ان کی ایک اہم تحقیقی تصنیف ''اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار'' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں رامپور کے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز سے شائع ہوئی، جو آج بھی اس موضوع پر ایک بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

اس سلسلے کو مزید وسعت دیتے ہوئے، جب وہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، انھوں نے نوبت رائے نظر کے ماہنامہ ''ادیب'' (۱۹۱۰ء-۱۹۱۳ء)، لکھنؤ سے شائع ہونے والا ''العصر'' (۱۹۱۸ء-۱۹۲۱ء)، کانپور کا رسالہ ''زمانہ'' (۱۹۰۳ء-۱۹۴۲ء)، الہ آباد کا ''ہندستانی'' (۱۹۳۱ء-۱۹۴۸ء)، گیا سے نکلنے والا رسالہ ''ندیم'' (۱۹۳۱ء-۱۹۴۹ء)، لکھنؤ کا ''صبحِ امید'' اور پٹنہ سے شائع ہونے والا ''معیار'' جیسے رسائل میں چھپنے والی اہم دستاویزی تحریروں کا انتخاب کثیر جلدوں میں شائع کرایا، جو اَب تحقیقی دنیا میں ایک قیمتی اثاثہ سمجھے جاتے ہیں۔

بیدار صاحب کی ایک اور نمایاں خدمت یہ ہے کہ انھوں نے ملک کی متعدد اورینٹل لائبریریوں جیسے رضا لائبریری (رامپور)، صولت لائبریری (رامپور)، ہمدرد لائبریری (دہلی)، اور خدابخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ نایاب اردو رسائل، جرائد اور اخبارات کی فہرستیں مرتب کرواکر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کے یہ کام نہ صرف اردو صحافت اور ادب کی تاریخ کے طالب علموں کے لیے اہم ہیں بلکہ مورخین، محققین اور دانشوروں کے لیے بھی ایک مستقل حوالہ اور رہنمائی کا ذریعہ بنے رہیں گے۔

مشہور علمی شخصیات کے تمام مقالات کو یکجا کرکے مجموعوں کی صورت میں بھی شائع کیا مثلاً مشہور محقق قاضی عبدالودود، مشہور مورخ پروفیسر حسن عسکری اور عربی کے مشہور اسکالر شبیر احمد خاں غوری کے مقالات کثیر جلدوں میں شائع کیے۔

بیدار صاحب شروع سے ہی مفاہمت بین المذاہب کے نظریے کے قائل تھے۔ اسی نظریے کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے خدابخش لائبریری سے ہندوازم پر اردو میں اور اسلام پر ہندی میں کتابیں شائع کیں۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران انھوں نے جنرل ضمیرالدین شاہ (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے تعاون سے ۲۰۱۶ء میں ''سینٹر فار انٹر فیتھ انڈر اسٹینڈنگ'' کے

عنوان سے ایک سنٹر قائم کیا جس کے تحت کئی بیش قیمت کتابچے شائع کیے گئے۔

پٹنہ کے قیام کے دوران اپنی گوناگوں مصروفیت کے سبب وہ دوسری جگہوں کے سمینارز میں شرکت نہیں کر پاتے تھے۔ لیکن 'دارالمصنفین' سے ایک تعلق اور دلی لگاؤ کے سبب ایک سمینار جو ''اسلام اور مستشرقین'' کے عنوان سے دارالمصنفین میں منعقد ہوا تھا، اس میں شریک ہوئے تھے۔ یہ جس تقریب میں بھی جاتے تھے اپنا آڈیو ٹیپ ریکارڈر ساتھ لے جایا کرتے تھے اور پوری روداد ٹیپ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ دارالمصنفین کے اس سہ روزہ سمینار کی مکمل روداد بھی ٹیپ کی تھی جو خدا بخش لائبریری کے آڈیو ویژول سکشن میں موجود ہے۔

بیدار صاحب کو دارالمصنفین اور اس کی مطبوعات نیز اس کے ماہانہ آرگن 'معارف' سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ اسے ''علوم اسلامیہ کا انسائیکلوپیڈیا'' کہا کرتے تھے۔ 'معارف' سے دلچسپی کے ہی سبب انھوں نے ''علوم اسلامیہ کا انسائیکلوپیڈیا'' کے عنوان سے اس کا موضوعاتی اشاریہ تیار کیا جو ماہنامہ 'برہان'، دہلی میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کے شماروں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ 'معارف' کا سب سے پہلا موضوعاتی اشاریہ تھا۔ بعد میں اسے آپ کی صاحبزادی ڈاکٹر شائستہ بیدار نے نئی ترتیب و اضافے کے ساتھ ۱۹۹۵ء میں خدا بخش لائبریری سے کتابی صورت میں شائع کیا۔

سنہ ۲۰۱۹ء میں جب ڈاکٹر شائستہ بیدار خدا بخش لائبریری کی ڈائریکٹر مقرر ہوئیں تو بیدار صاحب بھی ان کے ہمراہ پٹنہ چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ''علی گڑھ ڈائسپورہ'' کے نام سے ایک آن لائن اردو-انگریزی میگزین شروع کیا جس کا مرکزی موضوع سرسید اور علی گڑھ تحریک تھا۔

بیدار صاحب ایک بہترین انتظامی صلاحیت کے مالک تھے۔ خدا بخش لائبریری جیسی عظیم لائبریری کی گرتی ہوئی ساکھ کو انھوں نے فرش سے عرش تک پہنچا دیا۔ کام کے معاملے میں وہ نہایت ہی سخت گیر تھے۔ لہذا ایک اچھے سخت گیر منتظم کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، وہ اُن کے ساتھ بھی ہوا۔ لائبریری کے چند اسٹاف کو ان کی سختی پسند نہیں تھی۔ اندرونی اختلافات نے آہستہ آہستہ شورش کی شکل اختیار کرلی، جس میں بیرونی مخالفین بھی شامل ہوگئے۔ اُن کی مخالفت کو ہوا دینے کے لیے اُن کی ایک تصنیف ''سیما کی تلاش'' کو بنیاد بنایا گیا، جو ۱۹۷۰ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اُس کتاب میں سے نامکمل اور ادھورے جملے نکال کر شائع کیے گئے جن کی بنیاد پر چند نوآموز مقامی مفتیوں نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا۔ اس ہنگامے اور شورش کی آواز پورے ملک میں سنائی دینے لگی۔ جلسے، جلوس اور نعرہ بازیاں شروع ہونے لگیں۔ بہار کے گورنر، جو اتفاق سے مسلمان

تھے، وہ بھی مخالفین کی باتوں میں آکر اُن کے مخالف ہو گئے۔ مخالفین یہ چاہتے تھے کہ بیدار صاحب کو معزول کر دیا جائے۔ چونکہ ایکٹ کے مطابق بہار کا گورنر خدابخش لائبریری بورڈ کا چیئرمین ہوتا ہے لہذا مخالفین کو اس بات کی پوری امید تھی کہ چیئرمین اپنے عہدے اور پاور کا استعمال کرکے انھیں معزول کر دیں گے لیکن جب خدابخش لائبریری بورڈ کی میٹنگ ہوئی، اس میں مرکزی حکومت کے جو نمائندے آئے تھے، انھوں نے بیدار صاحب کی بھرپور حمایت کی اور نتیجہ یہ رہا کہ مخالفت کی یہ تحریک دَم توڑ گئی اور بیدار صاحب اپنی ملازمت کی مدت پوری کرکے عزت ووقار کے ساتھ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

فروری ۱۹۹۴ء میں آپ اس عہدے سے ریٹائر ہونے والے تھے لیکن آپ کو ملازمت میں دوسال کی توسیع ملی۔ لہذا دوسال بعد ۱۹۹۶ء میں ریٹائر ہو کر اپنے وطن رامپور چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر سید حامد صاحب نے اُن سے حکیم عبدالحمید صاحب کی حیات وکارنامے کے موضوع پر کام کرنے کی گزارش کی، جسے انھوں نے منظور کرلیا اور اگلے چند برسوں میں چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب مکمل کرلی۔

سنہ ۲۰۱۲ء میں آپ کی اہلیہ معزز جہاں بیگم کا رامپور میں انتقال ہو گیا۔ اسی سال آپ علی گڑھ منتقل ہو گئے اور اپنی صاحبزادی ڈاکٹر شائستہ بیدار کے ساتھ رہنے لگے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ملازمت کر رہی تھیں۔ ۲۰۱۹ء میں ڈاکٹر شائستہ بیدار کا پانچ سال کے لیے خدابخش لائبریری میں ڈائریکٹر کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔ بیدار صاحب بھی اپنی صاحبزادی کے ہمراہ اپریل ۲۰۱۹ء میں پٹنہ چلے گئے۔ ۲۰۲۳ء کے اواخر میں آپ کے جسم کے دائیں حصے پر فالج کا حملہ ہوا جس کے سبب آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ اپریل ۲۰۲۴ء میں جب ڈاکٹر شائستہ بیدار کی پانچ سالہ مدت ختم ہو گئی تو وہ اپنے والد کو لے کر علی گڑھ واپس آگئیں۔ یہاں میڈیکل کالج کے ڈاکٹرز کا علاج چلتا رہا۔ فزیوتھراپی بھی چلتی رہی جس کے سبب گھر میں ہی آپ کے چلنے پھرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ ۲۸ / مارچ ۲۰۲۵ء مطابق ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ بروز جمعہ (یوم الوداع) صبح میں طبیعت زیادہ بگڑی تو فوری ایمبولینس کے ذریعہ جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج لے جایا گیا جہاں تقریباً ۹ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ گھر والے فوری لاش رامپور لے گئے اور اسی روز بعد نماز عشاء آپ کی تدفین عمل میں آئی:

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

رسالہ نقوش طیبات، رحمت للعالمینؐ نمبر

بھٹکل کے معہد الامام حسن البنا سے شائع ہونے والا رسالہ نقوش طیبات، اپنے لائق مدیر مولانا محمد ناصر سعید اکرمی کے حسن ادارت کا مستقل گواہ بنتا جاتا ہے۔ اب تک اس رسالے کے کئی خاص شمارے اصحاب نظر سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کاغذ اور طباعت میں اعلی ذوق اور نفاست میں معیار بلند کا خیال اس رسالہ کی خاص پہچان بن گئی ہے۔

زیرنظر شمارہ رسول اکرمؐ کی شان رحمت للعلمینی کے موضوع کے تعلق سے اور بھی عظمت شان کا حامل بن گیا ہے۔ مضمون نگاروں میں زیادہ تر نئی نسل کے علماء واہل قلم ہیں، ہر تحریر میں سیرت کے الگ الگ جلوؤں کی کرنیں سمیٹی گئی ہیں خصوصاً آپؐ کے خلق عظیم کے روح پرور ذکر سے یہ مضامین بار بار پڑھے جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ زبان وبیان میں شعوری طور پر کوشش کی گئی ہے کہ یہ عام فہم ہو۔

لائق مدیر کی تحریر سادگی وسلاست کی خوبی کا نمونہ ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ آپؐ کی محبت کے دعوے زبانی ہیں ان کو عملی زندگی میں لانے کی ضرورت ہے، سارے مضامین اسی لہجے میں ہیں۔ اس لیے اثر رکھتے ہیں۔

قیمت درج نہیں ہے پتہ یہ ہے: امام حسن البنا شہید انسٹی ٹیوٹ، پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱ بھٹکل، کرناٹک۔

سہ ماہی مجلہ شیخ العالم ردولی شریف حضور صابر پاک نمبر

یہ رسالہ سواد اعظم اہل سنت وجماعت اور جامع چشتیہ خانقاہ شیخ العالم کا دینی علمی تحقیقی وتربیتی ترجمان ہے۔ شاہ آفاق احمد احمدی کی ادارت میں علمی ودینی حلقوں میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ حضرت شیخ العالم اور بعضوں کے نزدیک شیخ العالمین مخدوم احمد عبد الحقؒ کو دو سلسلوں سے حضرت علاء الدین صابریؒ کی سجادگی وجانشینی کا اعزاز حاصل ہوا اور شیخ ردولوی نے اس کا حق اس طرح ادا کیا کہ اس سلسلہ صابریہ کو غیر معمولی فروغ ان ہی کے ذریعہ ہوا۔ محققین نے اعتراف کیا کہ چشتیہ صابریہ

سلسلے کا سب سے پہلا مرکز ردولی ہی میں قائم ہوا۔ مخدوم صاحب کی خانقاہ رشد وہدایت کا اہم مرکز تو تھی ہی، سلسلۂ صابریہ کی مقبولیت کا بھی مرکز بن گئی۔ یہ تعلق صدیوں سے آج تک قائم ہے اور اسی کا ایک اظہار زیر نظر خصوصی شمارہ ہے۔ خانقاہ کے صاحب سجادہ شاہ عمار احمد احمدی کی تحریر سے اس خاص شمارہ کی ابتدا ہوتی ہے، جس میں انہوں نے خلافت یافتگان اور سجادگان کے آداب منصبی بیان کیے ہیں، اس میں اور بنیادی باتوں کے علاوہ سجادگی کے توارث کا ثابت ہونا بھی شامل ہے۔ مریدوں کی اصلاح وتربیت، خدمت خلق کے ساتھ تعلیمی مراکز کا قیام بھی آداب منصبی میں شامل ہے۔ یہ بھی لکھا کہ آج بعض خانقاہوں میں جانشینی محض وراثت کی صورت میں سمجھی جاتی ہے، چاہے جانشین اس کے لائق نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ خانقاہوں کی اصل روح ختم اور روحانیت عنقا ہوتی جاتی ہے۔

ادارتی تحریر ابتدائیہ کے عنوان سے ہے اور محمد شرافت حسین سعیدی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے ایمان، اسلام اور احسان کے ذکر کے بعد لکھا کہ المیہ آج کا یہ ہے کہ محض رسوم پرستی کو تصوف کی اصل روح قرار دیا جارہا ہے۔ انہوں نے جذب وسلوک کی تشریح بھی خوب کی کہ بندہ بغیر کسی ریاضت ومجاہدے کے معرفت خداوندی حاصل کرلے۔ ایک مضمون خواجہ گنج شکر پر ہے کہ خواجہ صاحب کی اجازت ہی سے مخدوم صابر کلیری نے کلیر کے لیے رخت سفر باندھا تھا۔ بعد میں جتنے مضامین ہیں وہ حضرت مخدوم صابر کلیری کے تعلق سے ہیں اور یہ محض روایتی نہیں ہیں۔ حضرت کلیری کے عہد میں اس وقت کی سیاسی صورت حال، ان کی تعلیمات اور مختلف علاقوں میں ان کے طریقۂ تربیت کے فروغ واشاعت پر تحقیقی شان کے حامل مضامین ہیں۔ احمد جاوید کی تحریر کا طرز جدت لیے ہوئے ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ”گجرات کا شہر سنجان وہ پہلا شہر ہے جس نے مدینہ کے بعد دنیا کی پہلی آئینی ریاست دیکھی“ مگر یہ دعویٰ پختہ دلیل کا محتاج ہی نظر آتا ہے۔ ایک مضمون سلسلہ صابریہ کے مشاہیر علماء کی دینی خدمات کے عنوان سے ہے، ڈاکٹر عارف الدین صابری میرٹھ کا یہ مضمون تحقیقی وعلمی شان کے لحاظ سے اپنی جانب متوجہ کرتا ہے اس میں مولانا عبدالسمیع بیدل رامپوری ومیرٹھی کی شخصیت اور ان کی تصانیف خصوصاً انوار ساطعہ کا جائزہ بڑی محنت سے لیا ہے۔ اسی طرح مولانا شاہ افضل بخاری، مولانا فخر الدین، سید شاہ تسلی حسین جیسے سلسلہ صابریہ کے اہم اکابر کا تذکرہ بڑی محنت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں اعظم گڑھ کے مولانا شاہ سلیم اللہ اعظم گڑھی کا ذکر بھی علامہ شبلی ومولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ ہے۔ مولانا احمد حسن کانپوری اور

مولانا مشتاق احمد کانپوری جیسے علماء صابریہ کے ذکر نے اس مضمون کو اور وقیع بنا دیا۔ اس کے علاوہ فاضل مضمون نگار نے مغربی اور شمالی علاقوں میں فیضان صابریہ کا احاطہ بھی خوب کیا ہے، بجا طور پر مدیر رسالہ نے ان تحریروں کو بہترین مضامین سے تعبیر کیا ہے۔ مشائخ تصوف کے ذکر و فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ خاص شمارہ واقعی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

زر سالانہ ۳۰۰ روپے ہے پتہ ہے سہ ماہی شیخ العالم چشتیہ ایجوکیشنل سوسائٹی ردولی شریف ضلع فیض آباد، یوپی ۲۲۴۱۲۰

رسالہ پیام عرفات کی خصوصی اشاعت بیاد حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

مولانا جعفر مسعود ندوی کا انتقال اسی سال جنوری کے مہینے میں ہوا۔ ایک ناگہانی حادثہ میں وہ مقام شہادت سے سرفراز ہوئے۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری تھے۔ عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ کے ایک تعلیمی ادارے میں درس و تدریس میں گزرا، ندوہ میں اکابر کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا اس کے پر کرنے کے لیے ان کا انتخاب ہوا اور نہایت کم عرصہ میں انہوں نے جس صلاحیت اور سلیقے سے کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس سے ان کی شخصیت ایک عجب شان سے ظاہر ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ جب اچانک ان کی وفات کی خبر آئی تو ملک و بیرون ملک میں ان کی تعزیت اور ہر طبقہ میں رنج و غم کی کیفیت دیکھی گئی۔ ان کے لیے ہر طبقہ کی نمائندہ شخصیات کا اظہار غم غیر معمولی تھا۔ زیر نظر رسالہ کا یہ خاص شمارہ بھی اسی غیر معمولی احساس غم کا ترجمان ہے۔ جس میں سینکڑوں تحریریں آگئی ہیں۔ ان میں اکابر اساتذہ، طلبہ، احباب و اقرباء کے جذبات، مرثیوں میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کثرت سے شاید ہی کسی اور شخصیت پر ایک ہی شمارے میں مضامین آئے ہوں، جعفر مسعود مرحوم کے علم سے زیادہ ان کے فضائل اخلاق کی جلوہ گری نے ان مضامین کو عجب تاثیر عطا کر دی۔ یہ محض ایک نہایت مخلص و خلیق متواضع و حلیم اور مجسم اخلاق کی یاد ہی نہیں، نئی نسل کے لیے ایک مثالی شخصیت کی خوبیوں کو خود میں جذب کرنے کی ترغیب بھی ہے۔

پیام عرفات کا یہ خاص شمارہ اسی لیے ملت کی نسل نو کے مطالعہ کے لیے فائدہ مند اور ضروری ہے۔

خاص شمارہ کی قیمت: ۲۰۰ روپے ہے۔ پتہ یہ ہے پیام عرفات مرکز الامام ابی الحسن ندوی دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی یوپی ۲۲۹۰۰۱

تبصرۂ کتب

پروفیسر عبدالحق، اقبال کے دینی تصورات (چند مباحث)، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، پتہ: عذرا بک ٹریڈرس، ۲۸۶۱- کوچہ چیلان، دریاگنج، نئی دہلی-۲، ای میل: azrapublication@gmail.com

اقبال کے جہانِ شعر میں چند ساعتیں گزارنے والے بھی ان کیفیتوں سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو جاتے ہیں جن سے فکر وفلسفہ اور ایک خاص تصور و نظریہ کی آگہی کا باب واہو تا نظر آتا ہے۔ ایسے میں جنھوں نے اقبال کی کائنات کی سیر کو ہر صبح وہر شام کا واحد شغل بنالیا، ان کے شعور و دانش کی بیکرانی کا اندازہ کرنا بہت مشکل نہیں۔ بے صبر نگاہ اور امیدوں سے لبریز دل جب اس 'نہایت' کا طلب گار ہو جائے جس کی کوئی نہایت نہیں تو پھر ایسوں کے لیے اقبال کی تفہیم، ان کا نصیبہ اور سرمایہ بن جائے تو تعجب کیا! اس کتاب کے فاضل مولف و مصنف کا تمام علمی و تحقیقی و ادبی سرمایہ جس متاع سے بے بہا ہوا وہ وجود رسول رحمت عالمؐ ہے اور اس سرمایہ کے حصول میں رہنمائی و روشنی ان کو اس قندیل سے ملی جس میں بقول ان کے شعاع آفتاب مصطفیؐ جلوہ ساماں ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اقبال کے فکری تصورات کی ساری کائنات اسی مصطفائی نور سے روشن ہے۔ یہ کہنے کا حق بھی زبان حق کو زیبا ہے کہ کسی شراب طہور کی شیرینی، خوشبو، رنگ اور حیات آفریں لطف و سرور کی طرح یہ افکار و تصورات، کلام اقبال میں اس طرح شامل ہیں کہ ان کو یک جا اور مرتب انداز میں پیش کرنا کسی بھی حوصلہ مند کے لیے ایک آزمائش سے کم نہیں۔ لیکن حسن وخیر کے جویا کے لیے ناکامی کا خیال بھی روا نہیں۔ زیر نظر کتاب میں قرآن وحدیث وسیرت اور بعض مقاماتِ طریقت کے حوالوں سے ثابت کیا گیا کہ اقبال کی فکر و نظر کا محرک اول وآخر صرف وجود رسول پاکؐ ہے۔ آپؐ ہی کے طفیل، نظر وخبر کی پرورش ہوئی اور آپؐ ہی علم و دانش کے سفینے کے نگہبان و ناخدا ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک و اثبات میں قریب دس مباحث ہیں اور یہ سب اپنے موضوع پر عشرہ کاملہ کا مصداق ہیں۔

اقبال کا غیر جانبدارانہ مطالعہ ان کے کسی بھی قاری کو اس اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے کہ

اقبال کی فطرت، آئینہ روز گار ہے اور غزالان افکار کا مرغزار ہے یا یہ کہ ان کے باطن میں ایک برق خوابیدہ ہے یا ان کی جولانئ طبع کے لیے کوہ وصحرا ہوں یا طوفانوں کو سمیٹے ہوئے سمندر رہوں، سب کی بے قراری کو قرار اس حقیقت کے ادراک سے آتا ہے کہ مسلک زندگی کی تقویم وہ دین ہے جو سرِّ محمد وابراہیم ہے۔ یعنی جہانِ رنگ وبو کی ہر شے رسالت مآبؐ سے کسب نور کرتی ہے یا پھر اس کے لیے چشم براہ رہتی ہے۔ ہنوز اندر تلاش مصطفیؐ است کا پیغام اس کے سوا اور کیا ہے؟ فاضل مباحث نگار نے اس نور کے اصل مصدر یعنی ذات الٰہی کی اس حقیقت کی نشان دہی کی جو اللہ نور السماوات والارض سے عبارت ہے۔ چند صفحات میں مدلل بتادیا گیا کہ اقبال کے فلسفے کی بنیاد آیۂ نور کا گہرا نقش ہے۔ اسی آیۂ نور کا بیان جب بے کراں ہوتا ہے تو پھر حدیث ہو یا واقعۂ معراج ہو، اقبال کا کلام، واقعی نور فشاں بن جاتا ہے اور ایک طالب حق کی زبان سے اس حقیقت کو عیاں کر دیتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ، بعثت رسالت مآبؐ ہے اور بعثت رسولؐ کا سب سے حیرت فروز واقعہ معراج کا سفر ہے۔ جس سے عالم غیب کے مشاہدات کی نور فشانی ہوئی۔ کلام اقبال یا فکر اقبال میں معراج کا واقعہ بھی سرچشمہ نور بن کر ظاہر ہوا۔ سر سبحان الذی ہی مدعائے علم الاسماء ہے اور اسی کی بدولت یہ کہنے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ:

شش جہات روشن زتاب روئے تو

ایک مضمون کا آغاز اس احساس کے ساتھ ہوا کہ رسول اکرمؐ کا ذکر، اقبال کے شعور وفکر میں روح کی طرح ہمیشہ جاری رہا۔

ایک اور بحث میں اس قسم کے نکتے فکر اقبال کی معنویت کو ظاہر کرتے نظر آتے ہیں کہ جمہوریت، اقبال کے نزدیک ملوکیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ جمہوریت کی تہہ میں سرمایہ داری کا وجود، ملوکیت ہی کی طرح اقتصادی غلامی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس اقتصادی غلامی سے پس ماندہ اقوام کبھی جاں بر نہیں ہوسکتیں۔ اقبال نے برسوں پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ اسی فکر نے ان اشعار کو وجود بخشا کہ:

تازہ کن آئین صدیقؓ و عمرؓ　　چوں صبا بر لالہ صحرا گزر
سروری در دین ما خدمت گری است　　عدل فاروقیؓ و فقر حیدریؓ است

ایک اور بحث میں تصور جہاد کے حوالے سے اقبال کے تصورات پر نظر کی گئی تو یہ نکتہ سامنے آیا کہ جنگ شاہاں، غارت گری ہے تو جنگ مومن کیوں سنت پیغمبری ہے۔ انسان کی بقا اور خیر کثیر کے فروغ کے لیے جہاد کی روح سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے، اس روح سے بے گانگی نے گمراہی پھیلائی ہے۔ اقبال کی اس آرزو کو صحیح اور سچے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ:

تیر و سناں خنجر و شمشیرم آرزوست بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

مقام شبیری کیا ہے، ایک بحث اس عنوان سے بھی ہے۔ شبیری نے قلم کو تصوف کے ذکر پر بھی آمادہ کر دیا اور یہ بیان بھی ہر مسئلہ تصوف کی طرح دلکش ہے خصوصاً رومی و اقبال کے رشتوں کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے اس مضمون میں لطف ہی لطف ہے۔

اقبال کے دینی تصورات کو وسیع تر نظریات میں دیکھنے کے لیے یہ کتاب شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی کتاب کیا، فاضل محقق کی ہر تحریر دین و شریعت کے حقیقی تصورات کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اس لیے کہ فکر اقبال ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ یہ فکر اقبال کی معقولیت اور مقبولیت کی دلیل بھی ہے۔ (عمیر الصدیق ندوی)

مولانا قمر الزماں مبارکپوری، ترتیب ڈاکٹر اختر الزماں مبارکپوری، سخن وران اعظم گڑھ (حصہ سوم خ سے س تک): متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات:۵۶۰، قیمت ۸۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: وہاج پبلی کیشنز، مبارک پور، اعظم گڑھ موبائل: ۸۸۸۱۷۴۲۰۱۹

سخنوران اعظم گڑھ کے نام سے ۲۰۲۱ء میں کتاب کا پہلا حصہ سامنے آیا جس میں ان سخنوروں کا ذکر تھا جن کے نام الف سے شروع ہوتے ہیں۔ قریب پانسو صفحات کا یہ تذکرۂ شعراء اس لیے حیرت انگیز تک قابل رشک بتایا گیا کہ قریب سو سے زیادہ مصادر سے استفادہ واستناد کی ایسی محنت، جاں کاہی، ژرف نگاہی، اب شاذونادر ہی ملتی ہے۔ پھر خود مرتب کی سخن سنجی، عبارت کی پختگی اور ادبی گل کاری نے جو جلوے بکھیرے وہ دوسروں سے زیادہ اپنوں کے لیے اس لیے ناقابل یقین تھے کہ مصنف پہلی نظر میں بجائے علمی کے محض عامی شخصیت کا پیکر تھا۔ کوئی دکھاوا نہیں، علم وفضل کی ادعائیت کیا اس کا معمولی اظہار تک نہیں، مگر قلم میں وہ طاقت اور جدت اور اسلوب وبیان میں وہ لطف ولذت کہ سطر سطر جاذبیت وکشش کی قوت ورعنائی کا نمونہ بن گئی۔

خیال آیا کہ ابھی تو حرف الف کی ابتدا ہے، حرف یاء کی نوبت خدا جانے کب آئے۔ پہلے حصے کی اشاعت، وسائل و وسائط سے محروم کے لیے، کسی دیوانے کے خواب کے پورے ہونے کی طرح تھی کہ مصنف کرونا کی بلا کی زد میں آگئے اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن درحقیقت اللہ نے ان کے نام کو شہرت دوام عطا کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا، دوسرے حصوں کے مسودے تیار ہو چکے تھے۔ دعا کی گئی کہ اللہ ان کی اشاعت کی کوئی سبیل نکال دے۔ اللہ تعالیٰ نے پکار سن لی اور مصنف مرحوم کے لائق بھائی نے باقی ماندہ حصوں کی اشاعت کی ذمہ داری اس طرح لی کہ اب یہ تیسرا حصہ بھی خوبصورت طباعت سے آراستہ ہو کر نظروں کے سامنے ہے۔ حرف خاء سے صاد تک قریب ایک سو چھیالیس شعراء کا تذکرہ مع کلام جمع کرنے میں ایک نحیف و نزار اور گمنام و گوشہ گیر وجود کو کیسی کیسی صعوبتوں اور ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا، اس کا اندازہ کتاب کے مشمولات سے لگایا جا سکتا ہے۔ سرزمین اعظم گڑھ سے تعلق وجہ انتخاب بنا خواہ وہ کسی درجہ کا ہو۔ اس کو تذکرہ اور نمونۂ کلام سے آراستہ کرنا اور وہ بھی تحقیق و جستجو کے روایتی ذرائع کی مدد سے، یہ کمال کی محنت و جستجو ہی سے ممکن ہے۔ کلام کا انتخاب بھی اس طرح کہ اعظم گڑھ کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تاریخ بھی مرتب ہو جائے۔

پہلی جلد میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ کتاب کا مقدمہ تھا، مقدمہ کیا وہ اعظم گڑھ کی ایسی مفصل تاریخ بن گیا جس کی جامعیت، کاملیت اور اولیت میں شبہ کا شائبہ تک نہیں رہا۔ سو سے زیادہ مصادر کی مدد سے یہ مقدمہ کتاب کی جان بن گیا۔ شاید اسی لیے سوا سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس مقدمہ کو پیش نظر کتاب میں شامل کر لیا گیا۔

لائق مرتب نے ترتیب و پیش کش میں حسن سلیقہ کا اظہار کیا ہے، کہیں کہیں ضروری حواشی بھی دیے ہیں۔ اچھا ہوتا کہ حصہ اول و دوم کے شعراء کی فہرست بھی بطور ضمیمہ شامل کر لی جاتی۔ شروع میں مصنف و مرتب کے والد ماجد عبدالمجید مرحوم اور مصنف مولانا قمر الزماں مرحوم کے سوانح، لائق مرتب نے بڑے پر اثر انداز میں قلم بند کر دیے۔ مرحوم بھائی کی علمی میراث کو زندگی دینے کا عمل یقیناً قدر و منزلت کے لائق ہے اور اسی لیے وہ باعث قبولیت بھی ہے۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص طور پر شعراء کے ذکر اور خطۂ اعظم گڑھ کی علمی و ادبی کامرانیوں سے خوش رہنے والوں کے لیے یہ کتاب بہترین سوغات ہے۔ (ع۔ص)

حکیم مولوی ابو الحسین ردولوی ترجمہ مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی، انوار الصفی فی اظہار اسرار الجلی والخفی: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۲۶۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ہاؤس، نمبر ڈی ر ۱۶، انصاری روڈ، دریا گنج نئی دہلی، ای میل: info@ephbooks.com

تاریخ کے صفحات کی گواہی اگر اعتبار کے لائق تسلیم کی جاتی ہے۔ تو یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ خطۂ اودھ کی سر زمین کو مذہبی شخصیات سے خاص تعلق رہا ہے۔ قدیم ہندوستان میں ماقبل تاریخ کے عہد رامائن سے بلکہ اس سے بھی پہلے حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی قبروں کے موہوم نشانات سے اب تک ہر دور میں اودھ کی سر زمین نیک اور صالح بندوں کا پتہ دیتی رہی ہے۔ آج بھی اودھ کے قصبات اور قریوں میں جگہ جگہ قبروں اور مزاروں کی شکل میں ان نیک بندوں کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ قصبہ ردولی میں شاہ احمد عبد الحق کا آستانہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔ اس آستانے سے شیخ عبد القدوس ردولوی ثم گنگوہی سے اب تک بزرگوں اور اہل تصوف کا ایک بابرکت سلسلہ جاری ہے۔ شیخ عبد القدوس کے جد امجد شاہ صفی الدین، شرقی سلطنت کے مشہور عالم قاضی شہاب الدین کے نواسے تھے۔ اسی خاندان میں بعد میں مولوی ابو الحسین عرف حکیم حسین علی ہوئے۔ جنہوں نے شیخ صفی الدین کے مزار کو درگاہ کی صورت میں محفوظ کیا اور صرف روضہ کی تعمیر ہی نہیں کی۔ شیخ صفی الدین کے ملفوظات کی تالیف بھی کی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ،سابق ناظم دار المصنفین بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، پروفیسر خورشید نعمانی مرحوم کا تعلق بھی اسی سلسلہ سے تھا۔ انہوں نے حکیم حسین علی کے ایک رسالہ کو دیکھا، جو شاہ صفی الدین کے احوال و اعمال اور مقامات سلوک، احوال مریدین اور مناسب حال حکایات اسلاف پر مشتمل تھا اور فارسی زبان میں تھا اور یہ اس لیے لکھا گیا تھا کہ طالبین اسرار اور صادقین روزگار کے لیے ابدی سعادت اور سرمدی دولت ثابت ہو۔ اس اہمیت کے پیش نظر پروفیسر خورشید نعمانی مرحوم کو اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوئی، زیر نظر کتاب یہی اردو ترجمہ ہے۔ یہ نوجوان فاضل مولوی عرفات اعجاز اعظمی کے قلم کا اعجاز ہی ہے کہ نہایت سلیس، شستہ اور رواں زبان و اسلوب میں ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کا نام عربی میں ہے، لیکن یہ رسائل تصوف کے لیے نامانوس نہیں، اس لیے اس کے ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حضرت شیخ صفی الدین کے انوار نو ابواب میں سمٹ گئے

ہیں جس میں خاندان، اجداد، درس و تدریس مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی سے بیعت، سیاحت ،ردولی میں قیام،عائلی زندگی،وفات پھر قابل فخر پوتے حضرت گنگوہی اور دیگر اولاد کا ذکر ہے۔ کتاب اصل رسالہ کے علاوہ ابتدا میں خورشید نعمانی مرحوم کے پیش لفظ اور شیخ مظہر الحق نعمانی کے دو مقدموں سے آراستہ ہے۔ مؤلف کا شجرہ بھی خاندانی معلومات کے لیے مفید اور ضروری سمجھ کر پیش کیا گیا ہے۔ باقی احوال کا ماحول وہی ہے جو ابرار واخیار کے تذکروں میں عام طور سے ملتا ہے۔ قلب و نظر کا تزکیہ اور تصرفات اولیاء، اوراد وظائف، تجرید و تفرید، فقر و زہد، نفی و اثبات، تعارض اولیاء، حدود ولایت جیسے مضامین عالیہ و اولیاء ہیں جن میں اصحاب تصوف کی دلچسپی کا بڑا سامان ہے۔ (ع۔ ص)

ڈاکٹر اطہر حسین، ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات (عہد سلیمانی تک)، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۹۶، ملنے کا پتہ: پاریکھ بک ڈپو 504/21C، ٹیگور مارگ، ندوہ کالج، ڈالی گنج، لکھنؤ، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۶۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۴۵۶۷۸۶، ای میل: atharhusainmanu@gmail.com

معارف بنیادی طور پر علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔ اردو کی اعلی صحافتی تاریخ میں اس کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ ۲۰۱۶ء میں منعقدہ معارف صدی تقریبات کے بعد معارف اوراس کے متعلقات پر تحقیقی مقالات اور کتابیں لکھنے کی جانب اہل قلم کی توجہ بڑھی ہے۔ ان کتابوں میں زیر تبصرہ کتاب کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل ہے کہ یہ باقاعدہ اپنے موضوع پر پہلا سندی مقالہ ہے اور ایک ایسے ایسوسی ایٹ پروفیسر کی نگرانی میں لکھا گیا ہے جس کو شبلی، دارالمصنّفین اور معارف سے یک گونہ دلچسپی بھی ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ "دارالمصنّفین اور ماہنامہ معارف: اجمالی تاریخ" میں ادارے اور رسالے کی مختصر مگر دلچسپ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ "ماہنامہ معارف کی تحقیقی خدمات" کے تحت قلمی نسخوں کی بازیافت، دکنیات، غالبیات، اقبالیات لسانیات سے متعلق مضامین کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور یہی حصہ اصل میں مصنّف کی محققانہ کدوکاوش اوران کے ناقدانہ شعور کا پتہ دیتا ہے۔ "متفرقات" کے تحت صاحب کتاب نے ادباوشعرا کے احوال، مختلف لائبریریوں میں موجو مخطوطات اور شعرا کے تذکروں سے متعلق بعض اہم مضامین معارف پر نگاہ تحقیق وتنقید ڈالی ہے۔ مقالات کے تعارف اور ان پر تبصرے کے دوران زیر بحث موضوع پر اب تک کیے گئے کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض مقامات پر محاکمہ کی کوشش بھی کی گئی

ہے۔ بعض تسامحات کی نشاندہی اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔

کتاب کی ان ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ بعض غلطیوں کی جانب نشاندہی ضروری اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ص ۱۵ پر معارف کو علامہ شبلی کے جاوداں علمی کارناموں میں شمار کیا گیا ہے جب کہ معارف ان کی زندگی میں جاری ہی نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح معارف سے وابستہ مدیروں اور بعض کالم نگاروں کے متعلق غلط تفصیلات کا اندراج اور بعض ضروری تفصیلات کا عدم اندراج باعث تعجب ہے۔ بعض مقامات پر تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ مصنّف اگر عہد سلیمانی تک محدود رہتے تو شاید اس غلط روی کے شکار نہ ہوتے۔ مثلاً ص ۶۲ پر لکھا گیا ہے کہ یہاں مدیران معارف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے لیکن پروفیسر ظلی کے بعد مدیر کے تعارف سے یہ حصہ خالی اور مصنّف کے اپنے بنائے ہوئے خاکے کے مطابق نہیں ہے۔ ص ۴۷ پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے انتقال پر لکھے گئے شذرات کو پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی کے قلم سے ہے۔ ص ۷۹ پر لکھا گیا ہے کہ معارف نے پوری صدی کے دوران صرف تین نمبر نکالے۔ جب کہ معارف صدی کے موقع پر ۲۰۱۶ء میں خصوصی شمارہ "ہندوستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں" نام سے دو جلدوں کی اشاعت کو خصوصی نمبر میں شامل کرنے کے بعد یہ تعداد چار ہو جاتی ہے۔ ص ۸۰ پر ہے کہ " جولائی ۱۹۱۶ء سے ہر چھ شماروں کی ایک جلد ہونے لگی اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے" حالانکہ اس وقت سال کے بارہ شماروں پر مشتمل ایک ہی جلد ہوتی ہے۔ ص ۸۱ پر لکھا گیا ہے کہ "معارف کی ضخامت ابتدا میں ہمیشہ سے ۸۰ صفحات رہی" جب کہ معارف ۸۰ صفحات میں جولائی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوا۔ ص ۸۳ پر ہے کہ "معارف نے اداریے کی جگہ شذرات لکھنے کی روایت ڈالی۔ جب کہ علامہ شبلی نے معارف سے بہت پہلے الندوہ، لکھنؤ میں اداریے کی جگہ شذرات لکھنے کی ابتدا کر دی تھی۔ ص ۸۵ پر اخبار علمیہ کے کالم نگاروں میں مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا نام لکھا گیا ہے جب کہ ان حضرات نے اخبار علمیہ کبھی لکھا ہی نہیں۔ قارئین معارف واقف ہیں کہ مولانا عمیر الصدیق دریابادی کی تحریریں تسلسل کے ساتھ ان کالموں کی زینت بنتی رہی ہیں۔ اس فہرست میں ان کے نام کی عدم موجودگی پر قاری کا سوال کھڑا کرنا یقیناً غیر موزوں نہ ہوگا۔ ص ۸۷ پر وفیات کے تحت مولانا عبد الماجد

دریابادی اور مولانا عبد السلام ندوی کا نام وفیات نگاروں میں شامل ہے جب کہ انہوں نے وفیات کبھی لکھی ہی نہیں۔ پروف کی غلطیوں کی کثرت کا اندازہ صرف ص ۴۶ پر چند کتابوں کے نام سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ احیام (احیاء) العلوم، راضہ (روضہ) تاج محل، نفحات (نفحات) الانس، بزک (تزک) جہاں گیری، انیس (مونس) الارواح، شاہ نصیر الدین (نصر احمد)، گلشن زار (راز)۔ اس جانب خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔

ان معمولی فروگذشتوں سے قطع نظر یہ کتاب معارف کے ان شائقین کو جو اس کے عہد اول کے تحقیقی جلووں سے اپنی نگاہیں روشن کرنا چاہتے ہیں پورا مواد فراہم کرتی اور ان کے لیے مفید ہے۔ امید کہ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ظفر الاسلام اصلاحی، قرآنی علوم کا ارتقاء عہد اسلامی کے ہندوستان میں، خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۲۵ء، صفحات ۲۳۴۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی کا شمار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان باوقار پروفیسروں میں ہوتا ہے جو قلم و قرطاس کے ذریعے علمی دنیا میں اپنی امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا اصل میدان عہد اسلامی کا ہندوستان ہے۔ اس پر ان کی نگاہ بڑی وسیع ہے۔ انہوں نے اسلامیان ہند کے اس زریں دور کا جائزہ مختلف جہات سے لیا ہے۔ اس پر ان کی کئی کتابیں ہیں مثلاً: عہد اسلامی کے عہد میں معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل، تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں اور اسلامی علوم کا ارتقاء عہد سلطنت کے ہندوستان میں۔ یہ کتاب 'قرآنی علوم کا ارتقاء عہد اسلامی کے ہندوستان میں' بھی اسی زریں سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب درج ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: علم قرأت کا ارتقاء عہد اسلامی کے عہد میں

باب دوم: کتاب قرأت کا ارتقاء عہد اسلامی کے عہد میں

باب سوم: علم تفسیر کا ارتقاء عہد اسلامی کے عہد میں

باب چہارم: عہد مغلیہ (بابر تا اکبر) کے ہندوستان کی تفسیری خدمات

باب پنجم: قرآنی علوم کا ارتقاء عہد جہاں گیری و شاہ جہانی و عالم گیری کے ہندوستان میں

باب ششم: دستور المفسرین: تعارف و تجزیہ

باب ہفتم: ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور ان کے وزراء، امراء و متعلقین کی قرآنی دل چسپیاں

اس کتاب کی تیاری میں فاضل مصنف نے بڑی جانفشانی کی ہے۔ انہوں نے دانہ دانہ جمع کر کے ذخیرہ بنایا ہے کیوں کہ یہ مواد مختلف کتب میں منتشر تھا۔ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ جن موضوعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، ان سے متعلق معاصر مآخذ و مراجع میں یک جا معلومات مرتب صورت میں بہت کم ملتی ہیں (صفحہ ۲۲)۔

فاضل مصنف کے نزدیک ہندوستان میں قرآنی علوم کی ترویج کی ابتدا سندھ میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد ہوئی۔ اس وقت سے سرزمین ہند میں حجاز اور عرب کے حصوں سے علماء و فضلاء کے ورود کا سلسلہ شروع ہوا اور اس خطے میں دینی علوم و فنون کی اشاعت کی ابتدا ہوئی۔ (ص ۲۸)۔

ایک جگہ فاضل مصنف نے مشہور سیّاح ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء-۱۳۷۷ء) کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد بن تغلق (دور حکومت: ۱۳۲۵ء-۱۳۵۱ء) کے زمانے میں گوا کے جنوب میں قصبہ ہنور (Hinaur) میں ۳۶ مدارس قائم تھے، ان میں ۱۳ مدرسے لڑکیوں کے لیے تھے، اور اس قصبے میں عورتوں میں حفظ قرآن کا عام رواج تھا (ص ۳۳)۔

مغلیہ سلطنت کے عہد میں درسیات میں تفسیر کے مقام پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس عہد میں تفسیر کا نصاب کسی بھی حیثیت سے فقہ سے کمتر نہ تھا۔ تفسیر کے نصاب میں یہ تین اہم تفسیریں نصاب میں شامل تھیں: تفسیر مدارک التنزیل (نسفی)، انوار التنزیل (بیضاوی)، اور کشاف (زمخشری) (ص ۹۰)۔

خلاصۂ بحث کے طور پر مصنف کا یہ تبصرہ لائق توجہ ہے کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں مسلم معاشرے کے مختلف طبقے کے لوگوں نے اپنے اپنے نہج سے قرآنی علوم کی اشاعت میں حصہ لیا۔ اس باب میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کی دل چسپیاں بھی مختلف طور پر ظاہر ہوئیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی بہت سی کوتاہیاں ہیں، مثلاً ان سے امور سلطنت میں قانونِ شریعت کی خلاف ورزیاں ہوئی ہیں، لیکن ایک حکمراں کی حیثیت سے انہوں نے بحیثیت مجموعی جو قابل قدر علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں، انہیں ابھی تک کماحقہ اجاگر نہیں کیا جا سکا۔ ضرورت ہے کہ مورخین اور محققین اس پہلو پر بھی توجہ مبذول کریں، تاکہ تصویر کے

دونوں رخ سامنے آسکیں۔ یہ کتاب خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب میں شامل ہے۔ (فضل الرحمٰن اصلاحی)

Glimpses from Sirah of Prophet Muhammad (مولانا سید جلال الدین عمریؒ کی کتاب ''اوراق سیرت'' کا انگریزی ترجمہ)، مترجم: پروفیسر عبد الرحیم قدوائی، ناشر: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی باشتراک ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ، ۲۰۲۴، صفحات ۴۰۸، قیمت: ۳۰۰۔

اسلامی ادب کے وسیع ذخیرے میں سیرت نبوی ﷺ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سیرت محض ایک تاریخی شخصیت کی زندگی کا بیان نہیں بلکہ اللہ رب العزت کے پیغام کا ایک عملی نمونہ ہے جو انسانی تجربے کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے مسلم مفکرین، علماء اور دانشوروں نے سیرت نگاری کو ہمیشہ ایک سنجیدہ فکری اور روحانی سرگرمی سمجھا ہے بالخصوص سامراجی دور کے بعد، جب مسلم معاشروں میں اخلاقی و فکری رہنمائی کی ضرورت مزید شدید ہو گئی۔

اسی روایت کی ایک جدید جھلک مولانا جلال الدین عمری کی تصنیف ''اوراق سیرت'' میں نظر آتی ہے۔ یہ کتاب سیرت مطہرہ سے نہ صرف فکری تعلق قائم کرنے کی دعوت دیتی ہے بلکہ روحانیت اور اخلاقی شعور کی ایک بلند سطح سے ہم سے ہم کلام ہوتی ہے۔ یہ ترجمہ نہ صرف سیرت نبوی ﷺ کی اس مستند کتاب کو انگریزی داں طبقے تک پہنچانے کا ذریعہ ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ایک قیمتی تحفہ ہے جو اردو زبان سے ناآشنا ہیں مگر سیرت نبوی ﷺ کے فکری و روحانی پیغام سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

''اوراق سیرت'' نبی کریم ﷺ کی مکمل سوانح نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا انداز ابن اسحاق، ابن ہشام کی کتابوں یا قرون وسطیٰ کی سیرت نگاری جیسا ہے۔ یہ کتاب ایک موضوعاتی مطالعہ ہے جس میں سیرت نبوی ﷺ کے اہم واقعات کی روشنی میں عصر حاضر کے مسلمان کو درپیش اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی سوالات پر سنجیدہ غور و فکر کیا گیا ہے۔ ممتاز اسلامی صاحب قلم اور جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا سید جلال الدین عمریؒ دینی فہم و فراست اور عصری شعور و آگہی کا حسین امتزاج تھے۔ آپ نے تمام زندگی دور حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت کا مطالعہ کیا اور آپ کی تحریروں میں یہی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ''اوراق سیرت'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مولانا عمریؒ نے نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کو صرف ماضی کی مقدس داستان کے طور

پر نہیں، بلکہ ایک ایسے ماڈل اور نمونہ حیات کے طور پر پیش کیا ہے جو دور حاضر میں اخلاقی رہنمائی فراہم کرنے والا ہے۔ کتاب کا اسلوب روایتی تاریخی ترتیب کا پابند نہیں۔ اس میں مختلف موضوعات پر مختصر اور جامع مضامین شامل ہیں جن میں رسول اللہؐ کی صفات عالیہ مثلاً عدل، حلم، صبر، انکساری، قیادت، بین المذاہب ہم آہنگی، عزم اور استقامت کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ انداز صرف معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست درس حاصل کرنے اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں عملی جامہ پہنانے کی بھی تحریک پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو سیرت مطہرہ کو صرف مقدس ومحترم سمجھنے تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اس کو قابل عمل نمونۂ حیات بھی بناتی ہے۔

ترجمہ صرف زبان کی تبدیلی کا عمل نہیں بلکہ ایک فکری اور روحانی ترسیل بھی ہے۔ خاص طور پر جب اصل متن میں اخلاقی گہرائی اور روحانی لطافت ہو، تو ترجمے کی ذمہ داری اور بھی نازک ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عبد الرحیم قدوائی اس حساس کام کو انجام دینے کے لیے ایک موزوں ترین انتخاب تھے۔ ان کا ترجمہ محض ایک لسانی مشق نہیں، بلکہ ایک فکری وثقافتی شاہراہ ہے جو وہ انگریزی قارئین تک پہنچاتا ہے جو ان کی رسائی سے باہر رہتے۔ مترجم کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی رہا ہوگا کہ اردو کے فکری وروحانی انداز کو انگریزی میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ نہ سادگی متاثر ہو اور نہ معنویت میں کمی آئے۔

اردو اور اس میں بھی بالخصوص دینی ادب میں تشبیہات، استعارات، اور تہہ دار تراکیب بھرپور ہوتی ہیں، جبکہ انگریزی، بالخصوص دور حاضر میں مستعمل نثر، زیادہ تر براہِ راست اور صاف گو ہوتی ہے۔ اگر ترجمہ بہت لفظی ہو جائے تو مطلب دھندلا سکتا ہے، اور اگر بہت آزاد ہو جائے تو اصل تاثیر جاتی رہتی ہے۔ پروفیسر قدوائی نے اس نازک توازن کو نہایت خوبی سے قائم رکھا ہے۔ ان کی نثر رواں، سلیس اور مفہوم سے مملو ہے جس میں اصل تحریر کا وقار اور اسلوب پوری طرح محفوظ ہے۔

جہاں مولانا عمری نے قرآنی رموز وتلمیحات، شاعرانہ اسلوب یا بین المتونی حوالہ جات دیے ہیں، وہاں مترجم نے ترجمے کے ساتھ ساتھ ضروری وضاحتیں بھی شامل کی ہیں تاکہ انگریزی قاری سیاق وسباق سے کٹ نہ جائے۔ یہ وضاحتی حواشی اُن مقامی اور ثقافتی حوالوں کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں جو اردو داں طبقے کے لیے تو واضح ہوتے ہیں مگر انگریزی پڑھنے والوں کے لیے اجنبی

ہوسکتے ہیں۔ یہ پہلو اس لیے بھی اہم ہے کہ مولانا عمری کی تحریر قرآنی آیات، احادیث، کلاسیکی شاعری اور اسلامی ثقافت کے اشاروں سے مزین ہے۔ ان کا بامعنی اور مؤثر ترجمہ محض زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک فکری دیانت داری اور فنی مہارت کا تقاضا کرتا ہے، اور پروفیسر قدوائی نے یہ کام نہایت باریک بینی اور ادبی سلیقے سے انجام دیا ہے۔

"اوراق سیرت" کا انگریزی ترجمہ ایک غیر معمولی علمی کاوش ہے جو صرف ایک لسانی خدمت نہیں بلکہ ایک فکری، اخلاقی، اور روحانی ضرورت کی تکمیل ہے۔ آج کے دور میں جب دنیا شناخت کے بحران، اخلاقی زوال، اور دینی امور میں غلط فہمیوں کا شکار ہے، سیرتِ نبوی ﷺ کا انگریزی جیسی عالمی زبانوں میں سنجیدہ ترجمہ خود ایک عبادت کے مصداق ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی ہمارے لیے صرف ایک تاریخی قصہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ لیکن اس نظام تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ قاری کی زبان، ذہن، اور سیاق سے ہم آہنگ نہ ہو۔ پروفیسر قدوائی نے مولانا عمریؒ کی فکر کو اس انداز میں انگریزی قالب میں ڈھالا ہے کہ پیغام کی روح بھی باقی رہے، اور جدید ذہن اس سے روشنی بھی حاصل کرسکے۔

یہ ترجمہ محض زبانی اور لغوی ترسیل نہیں بلکہ ایک فکری دعوت ہے جو سیرت نبوی ﷺ کے پیغام کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے دلوں تک پہنچاتی ہے۔ یہ ترجمہ اس قابلِ تقلید مثال کا مظہر ہے کہ جب اخلاص، علم، اور اسلوب ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو ترجمہ تخلیق کے برابر ہو جاتا ہے۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (سابق صدر شعبہ، اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی سرپرستی اور متعلقہ اداروں کی حمایت نے اس کام کو صرف ایک ترجمہ ہی نہیں بلکہ اسلامی علمی ترجمے کی روایت میں ایک سنگ میل بنادیا ہے۔ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو ماضی سے روشنی لے کر حال کے اندھیروں کو منور کرتی ہے اور قاری کو یاد دلاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی اُن دلوں میں زندہ ہیں جو ان کی زندگی سے روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(محمد حارث بن منصور، شعبہ برج کورس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

ادبیات

نعت نبیؐ

ڈاکٹر راہی فدائی

بنگلور (بھارت) موبائل نمبر:۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶

وفور نور ابجد' آپؐ کا صدقہ
عروج جہل کا رد' آپؐ کا صدقہ
شہود "لم یلد" شان "ولم یولد"
ہے جو عرفان سرمد' آپؐ کا صدقہ
یہ جبریل امیںؑ معراج کے خادم
ہوئے تلمیذ ارشد' آپؐ کا صدقہ
ازل کا نور آخر ہوگیا ظاہر
بحسن قامت و قد' آپؐ کا صدقہ
ملا امّت کو ابراہیمؑ کے دم سے
شعور جدّ امجد' آپؐ کا صدقہ
لبوں کو چوم کر بے حد ہوا نازاں
نصیب حجر اسود! آپؐ کا صدقہ
بہ اعجاز درود اب قلب سے نکلے
عداوت' کینہ و کد! آپؐ کا صدقہ
عروج ایسا! "رفعنا" ناز کرتا ہے
نہیں اس کی کوئی حد' آپؐ کا صدقہ
دہائی فکر نعت پاک کی دے گی
سخن کی کاوش و کد' آپؐ کا صدقہ
کبھی رکھتا نہیں ہے فیض رحمانی
حساب رفت و آمد' آپؐ کا صدقہ
سفر راہیؔ کا جاری جاں کی سمت' اس میں
کرشمے جلوہ گر صد' آپؐ کا صدقہ

رسید کتب موصولہ

عقیل کنٹریکٹر 'طلب گار'، اسفارزندگی (شعری مجموعہ): نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی، صفحات: ۱۹۲، سال اشاعت: درج نہیں، قیمت: ۴۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۰۰۳۸۷۰۴

ابو محمد علی ابن احمد، ابوسلمہ شفیع احمد بہاری (مرتب)، اسماء الصحابہ الرواۃ: ادارہ الترجمہ والتالیف، سرسید احمد روڈ کولکاتہ، صفحات: ۱۲۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۳۱۱۱۱۰۳۷

شیخ عبید اللہ بن عبدالسلام مبارکپوری، ڈاکٹر محمد اسلم مبارکپوری (مرتب)، انوارالعلم الربانی، چاند راگیری، میونسپلٹی، دوراڈپو، ضلع کاٹھمنڈو، نیپال، صفحات: ۵۱۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۱۵۴۱۱۸۱۱-۹۷۷

مولانا محمد سعید محدث بنارسی، تاریخ اہل حدیث (جلد ۱۵): الدار الاثریہ، نئ دہلی، صفحات: ۳۳۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۳۰روپے، موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

انیس احمد، تحقیق عمر عائشہؓ: مہتاب بکڈپو، ایک مینارہ مسجد تکیہ، اعظم گڑھ، صفحات: ۱۱۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۶۸۸۷۱۲۶

مولانا محمد ثناء اللہ عمری، چند سفروں کی داستان: مکتبہ الادیب محمد بن یوسف السورتی سامرود، سورت، گجرات، صفحات: ۲۱۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۳۱۳۰۰۷۷۳۶

ڈاکٹر فخر عالم ندوی، خطوط مشاہیر بنام پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن: ابن سینا اکاڈمی، ابن سینا اسٹریٹ، تجارہ ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ، صفحات: ۶۲۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۷۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۷۶۰۱۰۲۴۸۰

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، شبلی شناسی کی نئی جہات: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، صفحات: ۱۹۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، ایمیل: info@shibliacademy.org

ابو صادق عاشق علی اثری، طلاق کا صحیح، مسنون اور آسان طریقہ: الدار الاثریہ، اثری منزل، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۳۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

ابو سلمہ شفیع احمد بہاری، مظلوم اردو: ادارہ ترجمہ و تالیف سرسید احمد روڈ، کولکاتا، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۶۳۹۱۱۱۰۷۱۷

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

JUNE 2025 Vol- 212(06) ISSN 0974-7346 Ma arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org